Aaj Kal 1957 G.K.V.

1667

# آج کل

نومبر ۱۹۵۷ء
کاتک اگرہائن شک سمت ۱۸۷۹



۵۰ نئے پیسے

(1667)

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

# آج کل

1957

## دہلی

مجلسِ ادارت

| | |
|---|---|
| محمد مجیب | جامعہ ملیہ دہلی |
| محی الدین قادری زور | حیدرآباد |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| رحمان راہی | سری نگر |

یو۔ ایس۔ موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو سیکرٹری (مدیر مسئول)


سالانہ چندہ: ——— { ہندوستان میں:۔ چھ روپے / پاکستان میں:۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے: ——— نو شلنگ یا ایک ڈالر

[فی] پرچہ:۔ ——— { ہندوستان میں۔ ۵۰ نئے پیسے / پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۶ — نمبر ۴

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند


## ترتیب



سرورق:۔ بڑھائیے دیش کی پیداوار

**نومبر ۱۹۵۷ء**

کارتک اگرہائن شک سمت ۱۸۷۹

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

# مُلاحظات

## ایک قدم اور

بہار اور بنگال کی سرزمین میں سیلاب کی تباہ کاریاں ہر سال ہزاروں ایکڑ زمین کی فصلیں خراب کردیتی اور بے شمار بندگانِ خدا کو بے گھر بنادیتی تھیں۔ ان کی روک تھام کے لئے دامودر گھاٹی میں ماٹی تھون باندھ مکمل کیا گیا ہے۔ حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی رسمِ افتتاح ادا کی ہے ملکی توسیع و ترقی کی طرف یہ ایک بڑا قدم ہے۔ اس باندھ میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو جداگانہ نوعیت کی ہیں۔ اس کی اونچائی دریا کی سطح سے ۱۶۲ فٹ اور لمبائی ۲ ہزار فٹ ہے۔ اور یہ مٹی کا بنا ہوا ہے۔ دریائے دامودر کے معاون دریائے بارکر کے بہاؤ کو روکا گیا ہے۔ اس باندھ سے جمع ہونے والا پانی ایک زمین دوز بجلی گھر سے بجلی پیدا کرنے کے کام میں لایا گیا ہے۔ گھاٹی میں بڑے بڑے باندھ بنائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے باندھ بنا کر زمین کے کٹاؤ کو روکنے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ اس اسکیم سے ملک کی زرعی اور صنعتی ترقی کو فائدہ پہنچے گا۔

## دوسرا پنج سالہ پلان

پہلے پلان کی تکمیل سے جو کامیابی ہمیں حاصل ہوئی تھی اس سے ملک میں یقین اور حوصلے کی فضا پیدا ہوگئی تھی لیکن دوسرے منصوبے کے شروع ہونے کے بعد کچھ ایسے ناگہاں حالات درپیش آئے کہ بے یقینی اپنے قدم جمانے لگی ہے۔ نہر سویز کا قضیہ، اشیاء کی گرانی اور کچھ ایسی ہی دیگر وجوہ سے پلان کی لاگت بڑھ گئی ہے۔ ملکی ٹیکسوں میں اضافہ کرنا ناگزیر ہوگیا ہے۔ عوام کچھ اس سے پریشان نظر آتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ دوسرے پلان کے نشانے سہل طریقے سے حاصل نہیں ہوسکیں گے۔ لیکن اس قسم کی تشویش اور قنوطی رجحان ملکی ترقی کے لئے

آج کل دہلی

کبھی سازگار نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ نشانے ضرورت سے زیادہ اونچے رکھے گئے ہیں۔ لیکن دوسرے ملکوں کی ترقی کی رفتار کو اگر دیکھا جائے تو ہماری مقرر کردہ رفتار بھی سست نظر آتی ہے۔ یہ دورِ تیز گامی کا دور ہے سست خرامی کا نہیں۔

بیرونی زر کی کمی ایک بہت بڑی مشکل ہے۔ لیکن اس مشکل کا اندازہ اس وقت بھی تھا جب دوسرے منصوبے کی تشکیل ہو رہی تھی۔ فولاد اور دوسری بڑی صنعتوں کے لئے مشینوں وغیرہ کی درآمد نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ کچھ ایسی مشکلیں نہیں جو حل نہ ہوسکیں۔

وزیرِ منصوبہ بندی شری گلزاری لال نندہ نے اپنے اعلانات میں کہا ہے کہ غذائی اشیاء کی قیمتوں کو کم کرنے کی کوشش کی جائے گی اور مصارفِ زندگی ایک خاص سطح سے بڑھنے نہیں دیئے جائیں گے۔ اگر یہ دونوں باتیں ایک خاص حد تک درست ثابت ہوئیں تو ملک یک جہتی اور جوشِ عمل سے پلان کی تکمیل میں منہمک ہوسکے گا۔ ہمیں امید رکھنا چاہئے کہ ایسا ہی ہوگا اور ہم ایک دوسرے سے کہیں گے ع برنصیبِ خویش نازاں شد کہ منزل دور نیست

## بھارت کی مشرقی سرحد

بھارت کی مشرقی سرحد ایک مدت سے آشوب گاہ بنی ہوئی تھی۔ پہاڑوں اور جنگلوں کے اس علاقے میں نیم مہذب لوگ بستیوں سے دور ایک الگ تھلگ دنیا میں رہتے ہیں۔ سیاسی گمراہی کے زیرِ اثر انھوں نے آزادی کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ خود ان کی آبادی کا ایک کثیر حصہ اپنے آپ کو ہندوستان کا ایک جزوِ خاص سمجھتا تھا۔ ایک مدت سے ناگا ڈرکا مسئلہ تشویش ناک صورت اختیار کرچکا تھا۔

ایک طویل مدت کے کشت وخون کے بعد ناگاؤں کا ایک وفد حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے ملا اور انھوں نے اپنے مطالبات پیش کئے۔ چناں چہ مقام مسرت ہے کہ حکومتِ ہند اور ناگا لیڈروں نے ایک متفقہ فیصلہ کر لیا ہے۔ اس فیصلے کے مطابق ناگا قبائل کے تمام علاقوں کو ایک وحدت بنا کر مرکز کے تحت کر دیا جائیگا صدر جمہوریہ کے نمائندے کی حیثیت سے گورنر آسام اس کے حاکم ہوں گے۔ وزارتِ خارجہ اس علاقے کے نظم ونسق کی ذمہ دار ہوگی۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس خوش آیند فیصلے کے بعد ان علاقوں میں پائدار امن قائم ہو جائے گا اور انسانی جان ومال کا اتلاف ختم ہو جائے گا۔

## گرام دان

آچاریہ ونوبا بھاوے نے ہندوستان کے معاشی اور سماجی دُکھوں کا علاج سوچا تو وہ ایک عالم گیر تحریک لے کر میدان میں آگئے۔ انھوں نے اراضی پر انفرادی حق کے عوض اجتماعی حق کو جسے دوسرے لفظوں میں مشترکہ حق کہنا چاہیئے معاشی ڈھانچے کی بنیاد قرار دیا۔ گاندھی جی نے عدم تشدد کی بنیاد پر حق وصداقت کا نعرہ لگایا تھا۔ ونوبا جی نے بھی اپنی تحریک کی بنیاد حق وصداقت پر رکھی ہے۔

اس تحریک کی کامیابی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ میسور میں اکھل بھارتیہ سروسیوا سنگھ کے زیرِ اہتمام ایک آل پارٹیز کانفرنس حال ہی میں منعقد ہوئی جس میں سروسیوا سنگھ کارکنوں کے علاوہ کانگرسی، پرجا سوشلسٹ اور کمیونسٹ لیڈر بھی شامل تھے۔ ان سب نیتاؤں نے گرام دان کی تحریک کی تائید کی ہے۔ یہ تحریک مقبولیت کی منزلیں طے کر کے عوامی تحریک بن رہی ہے اور حقیقت میں ہندوستان جیسے ملک میں بالخصوص مفلسی اور بیروزگاری کو دُور کرنے میں اس تحریک سے بڑی مدد ملے گی۔

ابھی تک ونوبا جی کے مخلص ساتھیوں کی تعداد زیادہ نہیں اس کے باوجود تین ہزار گاؤں گرام دانی بن چکے ہیں۔ کیرالہ میں آج کل کمیونسٹ پارٹی برسرِ اقتدار ہے۔ اس صوبے میں بھی ونوبا جی کامیاب ہو چکے ہیں۔ چنانچہ کیرالہ میں ۲۰۱ گرام دانی گاؤں ہیں۔ دنیا میں معاشی اور سماجی انقلاب آتے ہیں لیکن قانون یا تلوار کے زور سے۔ لیکن یہ تحریک کسی قسم کے دباؤ یا سختی کے بغیر چل رہی ہے۔ خود اختیاری عمل سے جو کام ہوتا ہے وہی مستحسن ہوتا ہے اور اسی کے نتائج دیرپا ہوتے ہیں۔

اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کو ایک مشترکہ قومی پلیٹ فارم مل گیا ہے۔

## ہمارے مہمان

نائب صدر یوگوسلاویہ اس وقت ہندوستان کا دَورہ کر رہے ہیں۔ ویت نام کے صدر ڈاکٹر ہوچی منہ اور شاہِ افغانستان یہاں آنے والے ہیں۔ ہم ان مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہندوستان عالمگیر دوستی اور امن کا پیغامبر ہے۔ دوسرے ملکوں سے خوشگوار تعلقات اس کی پالیسی میں اوّلیت کا مقام رکھتے ہیں۔ اسی مقصد سے چین، منگولیا، لاؤس کمبودیا اور ویٹ نام کا دَورہ کر کے ہمارے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن حال ہی میں واپس آئے ہیں۔

## ریاستی وزرائے تعلیم کی کانفرنس

مولانا ابوالکلام آزاد نے ریاستی وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں فرمایا کہ ریاستوں کو تعلیمی ترقی کی طرف دوسرے منصوبہ کے پروگرام کے مطابق قدم بڑھانا چاہیئے۔ ریاستوں اور مرکز کے اشتراکِ باہم ہی سے یہ کام مکمل ہو سکتا ہے۔ حالانکہ زیادہ تر ذمہ داری ریاستوں ہی پر ہے۔ مرکز تو صرف تعلیم کا ایک معیار رکھنے اور ریاستوں میں باہمی ربط برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ طلباء کے اندر وقار اور احترام کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے بنیادی تعلیم کی بہت ضرورت ہے۔ یہ طریقۂ تعلیم ہندوستان جیسے ملک کے لئے جس کی آبادی بہت زیادہ ہے، نہایت مفید ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ملک میں ۲۵۰۰ ہائر سکنڈری کثیر مقصدی اسکول قائم کئے جائیں گے۔ چناں چہ ۱۲۰۰ ہائر سکنڈری اسکولوں کو دوسرے پنج سالہ منصوبے کے آخر تک کثیر مقصدی اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

## اُردو کی مقبولیت

'ہماری زبان' کے حوالے سے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ اڑیسہ میں اُردو بولنے والوں کی تعداد ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ایک لاکھ ۴۹ ہزار ہے۔ چناں چہ اُڑیا اور تلنگو کے بعد اڑیسہ میں اُردو ہی کا نمبر ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اُردو اور فارسی کی پڑھائی کا انتظام ہے۔ یہاں ایک صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں شیخ امین اللہ حرفی رضوانی۔ شہر کٹک میں اُردو کے چھوٹے چھوٹے کتب خانے قائم ہیں بھدرک میں اُردو کا ایک بڑا کتب خانہ رفیع لائبریری کے نام سے قائم ہے۔

پنڈت لکشمی نرائن مصرا نے 'بھگوت گیتا اور اسلام' اُردو میں لکھی ہے۔ موصوف کی مادری زبان اڑیا ہے۔

محترمہ میری ولیمس نے لندن سے برطانوی مستشرقین اور اُردو کے عنوان سے ہمیں مضمون ارسال کیا ہے۔ آپ لندن یونی ورسٹی میں بی اے آنرز (اُردو) کی طالب علم ہیں آپ کو اُردو سے جو شغف ہے اس کی داد نہ دینا کفر ہوگا۔ ادارہ آپ کے مضمون کے لئے آپ کا شکر گزار ہے۔

سلامت اللہ

# مومن، بہ حیثیت مثنوی نگار

مومن کا میدان غزل ہے۔ وہ غزل گو شعراء کی صفِ اوّل میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی مثنوی پر قلم اٹھانا اگر بے تُکا نہیں تو کچھ عجیب سا ضرور لگتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مومن کی مثنوی کا مطالعہ اور تجزیہ نہ صرف ضروری بلکہ مفید بھی ہے۔ مومن کی شاعری کو سمجھنے میں ان کی مثنویوں سے بڑی مدد ملتی ہے وہ مومن کی شخصیت کے ان تخلیقی سرچشموں کی سراغرسانی کرتی ہیں۔ جن سے ان کا گلستانِ سخن شاداب ہے۔ ان میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ اس زمانے کی سماجی اور تہذیبی زندگی کے بعض پہلوؤں کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ جس سے ہمیں تاریخی پس منظر کا واضح ادراک ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مومن کی مثنویوں کی ایک فنی اہمیت بھی ہے۔ یہ مثنویاں ایسی رچی ہوئی ہیں کہ ان سے بعض اس صنفِ سخن کے ماہروں نے کسبِ نور کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ غالباً مشہور مثنوی نگار مرزا شوق لکھنوی نے مومن کی مثنویوں ہی کو زبان و بیان کے لحاظ سے اپنا نمونہ بنایا تھا۔ ضخامت کے اعتبار سے دیکھئے تو بھی مومن کی مثنویاں ان کے کلام میں خاص درجہ رکھتی ہیں۔ کلیاتِ مومن میں چھ مثنویاں شامل ہیں اور وہ کُل کا تقریباً ایک تہائی حصہ ہیں۔

مومن نے یہ مثنویاں اپنی عمر کی مختلف منازل میں لکھیں۔ پہلی مثنوی ۱۸۱۶ء کی ہے۔ جب کہ عنفوانِ شباب کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ جیسا کہ وہ خود اس مثنوی کے آخری حصے میں کہتے ہیں ؎

دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن ہے ابھی سترہ برس ہی کا سن

مومن کی آخری مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۸۳۰ء ہے اس طرح انھوں نے اپنی ساری مثنویاں چودہ سال کی مدت میں تخلیق کیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مومن کو مثنوی سے لگاؤ بلوغ کے بعد کافی عرصے تک رہا، جب کہ وہ خاصی ذہنی اور فنی پختگی حاصل کر چکے تھے۔

اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ مومن کی تمام مثنویوں پر تفصیل سے بحث کی جا سکے۔ یہاں ان کی صرف پہلی مثنوی "شکایتِ زمانہ" پر روشنی ڈالی جائے گی اور اسی کے ذریعہ ان نکات کی کسی قدر وضاحت کی جائے گی جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

مثنوی شکایتِ زمانہ مومن کی سب سے پہلی مثنوی ہے اور اسے انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں لکھا تھا۔ میدانِ شعر و سخن میں وہ ایک تازہ وارد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ابھی ان کا فن پختگی اور گہرائی، حسن اور کمال کے ابتدائی مرحلوں سے گزر رہا تھا۔ پھر بھی مومن کی شاعری میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ کیونکہ اس کی ہیروئن غالباً وہی "صاحب جی" ہیں جن کا مومن کی جذباتی زندگی میں بڑا دخل ہے اور جو ان کی تخلیقی کاوشوں کی بڑی حد تک محرک ہے۔

اس مثنوی کی تمہید میں دو خط ہیں، جو محبوبہ کے نام لکھے گئے ہیں۔ تاثر میں شدت پیدا کرنے کی خاطر مبالغہ آمیزی کی گئی ہے۔ عاشق اپنی حالتِ زار کو یوں بیان کرتا ہے ؎

اک آگ سی لگ رہی ہے تن میں شعلے سے بھڑکتے ہیں بدن میں
بستر کئی بار سب جلایا اس آگ نے خاک میں ملایا
سب جوشِ عرق سے گھل گیا جسم ہر عضو میں کیا رہا بجز اسم

پہلا خط دعا پر ختم ہوتا ہے ؎

ہر شب تجھے عشرتِ دل افروز    ہر روز ہو تیرے گھر میں نوروز
ہر شام طرب سعید تجھ کو    ہر صبح ہو صبحِ عید تجھ کو

اور اس نشاط و شادمانی میں عاشق خود بھی شریک ہونا چاہتا ہے ؎

ہو دل میں بھی شریکِ محفلِ نور    تو مجھ سے رہے میں تجھ سے مسرور

دوسرے خط میں اخلاقی اور مذہبی ضابطوں پر ایک تیکھا طنز ہے ؎

ہے تجھے پاک دامنی کا خیال    مار ڈالے ہے مجھ کو شوقِ وصال
شرطِ دیں ہے جو پاکِ دامانی    تو ستم بھی ہے نامسلمانی
مجھ سے عاشق کی یوں دل آزاری    ہو وے فی النار ایسی دینداری
بے وفا بندۂ خدا گر ہوں    لیک تجھ سے پھروں تو کافر ہوں
تو جو ہے ہاشمی نسب لے جاں    ہے محبت تری مرا ایماں

ان دو خطوں کے بعد اصل مثنوی شروع ہوتی ہے۔ حسبِ روایات ابتداء میں ساقی نامہ ہے اور پھر قصہ جس میں اپنے خاندان کی فارغ البالی کا اشارہ ہے اور بچپن ہی سے عشق کے غلبہ کا تذکرہ ہے ؎

ہائے بچپن میں دل کا آجانا    کچھ سمجھتے نہ تھے یہ کیا جانا
شوق آیا تو دل نیازی کا    کھیل کھیلے تو عشق بازی کا
شغلِ طفلانہ دل کے پاس گئے    ہوش کے آتے ہی حواس گئے
عمر تکلیف کی نہ آئی تھی    میں نے تکلیف جب اٹھائی تھی
پہنچے سنِّ وقوف کو بھی نہ ہم    کہ ہوئے واقفِ رموزِ الم

عہدِ طفل کے عشق نے تعلیم کو کس طرح متاثر کیا۔ اسے بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں رعایتِ لفظی کا حسن خاص طور پر نمایاں ہے ؎

کچھ نہ سیکھو سکھا دیا دل نے    سبق الٹا پڑھا دیا دل نے
لذت آئی جو لفظ الفت سے    پڑھتے دائم الف کے آگے "تے"
بس کہ تھا دل میں شکوۂ بیداد    سبق الحمد کا نہ رہتا یاد
زلف و لب مرِ خط دلِ غمگیں    نام لکھتے تو لیلیٰ و شیریں
'واؤ' پڑھتے تو ہونٹ کاٹتے ہم    'لام' آتا تو لب کو چاٹتے ہم
'بے' لکھے سے جو ہونٹ مل جاتے    بوسۂ لب کے لطف یاد آتے

اور جب محبوبہ کی یاد ستاتی اور دل بھر آتا تو رونے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کرنا پڑتا۔ کچھ ایسی تدبیر کرتے کہ استاد کو سزا دینی پڑتی اور رونے کا بہانہ پیدا ہو جاتا۔

جورِ استاد کی خوشی ہوتی    عذرِ فریاد کی خوشی ہوتی
رونے کو ایک بہانہ ہو جاتا    حیلۂ آہ و نالہ ہاتھ آتا
بس کہ یادِ نگار میں روتے    تختۂ مشق اشک سے دھوتے

گویا استاد کی مار پیٹ سے یک گونہ سکون میسر ہو جاتا۔ کیوں کہ اس سے رونے کا موقعہ ملتا اور دل کی بھڑاس نکل جاتی۔ یہاں اس نفسیاتی کیفیت کی کیسی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔

چوری چھپے ملاقاتیں ہونے لگیں لیکن اس سے تشفی ہونے کے بجائے تشنگی بڑھتی گئی۔ فراق و وصال کی کشمکش میں دو سال بیت گئے۔ رازِ محبت بھلا کہیں چھپائے چھپتا ہے۔ متعلقین کو معلوم ہو گیا کہ معاملہ کیا ہے تو دونوں طرف سے ملنے جلنے کی ممانعت ہو گئی۔ خوش قسمتی سے کسی عزیز کی شادی میں پھر ملاقات کا موقع مل گیا

ایک خالی مکان میں آکر    مل گئے چپکے چپکے ڈھب پاکر
کیا ملاقات رشکِ تنہائی    دمبدم تازہ حسرت افزائی
دونوں جانب سے نالہ و فریاد    شکوۂ جور و طعنۂ بیداد
اشک آنکھوں سے متصل جاری    خونِ دل تا بہ لختِ دل جاری

اس ملاقات کے بعد جدائی کا منظر اس طرح پیش کیا ہے ؎

آگیا وہ ہی دن ہیں روزِ نشور    منتشر ہو گئی وہ بزمِ سرور
وہ نگاہ ہراس آلودہ    حرفِ امید یاس آلودہ
آرزوئے وصال کی باتیں    ممکن و احتمال کی باتیں
سخنِ اتفاق سے تسکیں    اثرِ اشتیاق سے تسکیں

اتنی مختصر ملاقات کے بعد جدا ہونے سے دو چاہنے والوں پر جو گزری ہوگی اسے یہاں صرف چند اشاروں سے حسین اور مؤثر انداز میں بیان کیا ہے

اس کے بعد ہجر کی طویل داستان ہے جس کا اختتام یوں ہوتا ہے ؎

ایک دن جی زیادہ گھبرایا    جانِ بیتاب کو نہ صبر آیا
گئی جنت میں بس کہ ایسی حور    ہوئی بیتاب کیسی کیسی حور
مجھ کو جس وقت یہ خبر آئی    بیہشی مرگ کی خبر لائی
پاسِ بدنامی اک ذرا نہ رہا    ہوش ناموس و ننگ کا نہ رہا
شورِ محشر خروشِ واویلا    نعرۂ صور جوشِ واویلا

محبوبہ کی موت نے چاہنے والے کا برا حال کر دیا۔ تمام عزیزوں اور دوستوں کو یہ دیکھ کر فکر اور پریشانی ہوئی اور اسے اچھا کرنے کی طرح طرح کی تدبیریں کی جانے لگیں۔ چارہ سازوں کو شبہ ہو گیا کہ مریضِ عشق اپنی جان سے ہاتھ

دھو بیٹھے گا۔ اس لئے اس کی ہر طرح نگرانی کی جانے لگی۔ مگر اس نے قیدِ حیات سے چھٹکارا پانے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس لئے اس نے بظاہر اپنے آپ کو سنبھالا تاکہ احباب اس کی طرف سے مطمئن ہو جائیں اور پھر وہ کنجِ خلوت میں کچھ کھا کر ہمیشہ کے لئے سو جائے۔ چناں چہ ؎

نفس تیز تیز کو روکا　　نالۂ شعلہ ریز کو روکا
ظاہر آزار کچھ غرض نہ رہا　　لاغری کے سوا مرض نہ رہا
فرق جوش و خروش میں آیا　　میں بصد زور ہوش میں آیا

اسی مصائب و آلام کے زمانے میں ایک اور حادثہ پیش آیا کہ ایک دن ناگہاں کسی زہرہ جبیں سے آنکھیں چار ہو گئیں اور عاشقِ زار جو اپنی محبوبہ کے غمِ فراق میں جان دینے پر تلا ہوا تھا اس نئے جال میں پھنس گیا ؎

دیکھ زانو پر اس کے سر اپنا　　تھا دماغ آسمان پر اپنا
حرف منہ سے جو اس کے نکلے پڑیں　　ایک غنچے سے لاکھ پھول جھڑیں
حال پوچھا جو ناتوانی کا　　بڑھ گیا زور سخت جانی کا
پوچھنا اب مزاج کیسا ہے　　غش یہ پھر آج تم کو کیسا ہے
جاں سے یوں گذر نہیں جاتے　　موئے سر کے پیچھے مر نہیں جاتے
جا کے خلد بریں میں مل لینا　　داد امید ہائے دل لینا
خط اٹھاؤ ذرا جوانی کے　　کچھ مزے دیکھو زندگانی کے
متّصل کی جو اس نے دلداری　　نہ رہی زندگی سے بیزاری
روز گلہائے انبساط کا جوش　　ہر سحر خندۂ نشاط کا جوش
کوئی آیا تو ہٹ گئے ناچار　　ورنہ ہر لحظہ شغلِ بوس و کنار

مگر سرخوشی اور شادمانی کا یہ دور بہت عرصہ تک قائم نہ رہ سکا ؎

ایک دن ہم موافقِ معمول　　تھے نشاط و سرور میں مشغول
بادۂ شوق وصل سے مدہوش　　محو لذّاتِ بوسہ و آغوش
نیند دونوں کو آگئی ناگاہ　　بخت بھی اپنے ساتھ سو گئے آہ
حائل اک پردۂ حجاب نہ تھا　　ہوش جاتے سب تھے خواب نہ تھا
ایک صیاّلہ وال چلی آئی　　ایک سر پر بلا نئی لائی

اس عورت نے ہر جگہ یہ خبر پھیلا دی اور بدنامی اور رسوائی کا وہ بازار گرم ہوا کہ کسی کو منہ دکھانے کی ہمّت نہیں ؎

دیکھتے کیا ہیں اک قیامت ہے　　شورِ محشر دمِ ملامت ہے

کوئی کہتا تھا آپ کی کیا بات　　اتنی سی عمر اور یہ حرکات

جب یہ خبر گھر پہنچی تو بلوائے گئے اور ہر شخص نے لعنت ملامت کی ؎

دور بس یاں نہیں ہے تیرا کام　　گھر سے خانہ خراب کو کیا کام
ہم کو بدنام کر دیا تو نے　　اے زبوں کار کیا کیا تو نے
کہیں کس منہ سے جائیں گے اب ہم　　ہائے کیا منہ دکھائیں گے اب ہم
جانتے تھے کہ ہے ابھی بے ہوش　　کیا خبر تھی کہ یاں ہیں ایسے ہوش
تیرے جینے سے جیسا تھا دل شاد　　اب خوشی موت کی ہے اے ناشاد

اس ڈانٹ پھٹکار اور طعن و تشنیع کا اثر یہ ہوا کہ آپ رو دیئے اور اپنی معصومیّت ثابت کرنے کے لئے یہ بات بنائی کہ مفسدوں نے جھوٹ تہمت لگائی ہے ؎

مجھ سا نادان عشق کیا جانے　　شوقِ زلفِ سیہ بلا جانے

اس پر اُن کو معاف کر دیا گیا۔ لیکن وہاں آنے جانے پر پابندی لگا دی گئی ؎

کی وہاں جانے کی مگر بندی　　مجھ سا دل بند اور نظر بندی
دام تارِ نگاہ میں ہیں اسیر　　حلقۂ چشم، حلقۂ زنجیر

فراق کے زمانہ میں دونوں کا بُرا حال ہو گیا۔ ایک روز اتفاقاً ملاقات ہو گئی تو محبوبہ نے اپنی حالتِ زار کا ذکر یوں کیا ؎

میں کہاں اور کہاں فسانۂ عشق　　ہو گیا خواب سا زمانۂ عشق
میں کہاں اور فکرِ آرائش　　سادگی بھی ہے رنگِ آسائش
میں کہاں اور کہاں وہ نازِ غرور　　بات کرنے کا بھی نہیں مقدور
میں کہاں اور کہاں خود آرائی　　بے خودی ہو گئی تماشائی
ہے نظر میں میرے سیہ عالم　　سرمہ آلودہ کیا ہو دیدۂ نم
منہ میں پڑتی نہیں ہے کھیل اکثر　　زندگانی ہے غصہ کھانے پر
بھوک بھی گر لگے تو غم کھاؤں　　تشنگی ہو تو اشک پی جاؤں

اپنی حالت بیان کرنے کے بعد آئندہ ملنے کی یہ تدبیر بتائی ؎

جب کہ اک ایک گھر میں سو جاوے　　بے خود اپنی طرف سے ہو جاوے
آؤ تم یاں پہ ہوشیاری سے　　پختگی سے نہ خام کاری سے

اس طرح چوری چھپے ملنے میں جو کیفیت ہوتی ہے اس کی کیسی سچی تصویر کھینچی ہے ؎

ہٹتے آنکھوں سے ڈرتے ڈرتے رواں　　لغزشِ پا تھی جنبشِ مژگاں
تیرہ بختی نے کیا ڈرایا تھا　　سایہ اپنا پری کا سایہ تھا

کچھ دن اسی انداز میں بیتے چلتے رہے۔ مگر یہ راز کب تک پوشیدہ رہ سکتا تھا! محبوبہ نے بدنامی سے ڈر کر قطع تعلق کر لیا۔ جدائی کے دوران میں دلِ عاشق پر کیا کچھ نہ گزری ہوگی۔ جب بے قراری حد سے زیادہ بڑھ گئی تو کوئے جاناں کا پھر رُخ کیا ؎

پھر گئے وصل سے ہوئے بیہوش  بن گیا گھر دکان بادہ فروش
تلخ کامی کو تلخ کام کیا  دردِ ہجراں سے انتقام لیا
کاہشِ یاس کا جگر خوں تھا  دونوں کا شوق روز افزوں تھا

مگر یہ دورِ انبساط بھی بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ ایک بڑھیا محبوبہ کی رازدار بنی ؎

جب یقیں ہوگیا کہ یاس ہے یہ  محرم راز، رازدار ہے یہ
لگے ہونے ہر ایک طرح کے کلام  ہوئی آخر ذریعۂ پیغام
جب بلائے وہ آکے لے جائے  میں جہاں ہوں بلا کے لے جائے

یہی بڑھیا بالآخر اس المیہ کا باعث ہوئی جس پر یہ قصہ ختم ہوتا ہے۔

ایک دن جو بلانے آئی وہ  دن نہ تھا، تھی شبِ جدائی وہ
ڈھونڈ کر پھر ٹھکانے میں ظالم  پہنچی دیوان خانے میں ظالم
بند دروازہ واں کا تھا ناگاہ  در کشائے سخن دلِ آگاہ
کہا میں نے کہ رہ کے آؤں گا  ایک دو شعر کہہ کے آؤں گا

اس سے بڑھیا کے پندار پر چوٹ پڑی۔ انتقام کی خاطر اس نے گھر جاکر یہ بات بنائی کہ میں نے دروازے کے سوراخ سے دیکھا کہ وہ ایک پری وش کے پاس بیٹھے ہیں اور وہیں سے بولے "آؤں گا تو چل۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سفینۂ محبت کدورت کے بھنور میں پھنس کر تباہ ہوگیا ؎

میں جو آیا تو التفات نہیں  وہ نظر، وہ سخن، وہ بات نہیں
رشک جب باعثِ کدورت ہو  پھر صفائی کی خاک صورت ہو

اور یہ قصہ اس طرح ختم ہوتا ہے ؎

مومنؔ آتو بھی اپنے نام پہ جا  نام کو ان بتوں کے آگ لگا
چھوڑ بس اُلفتِ مجازی کو  کر سلام ایسی عشق بازی کو

یہ ہے مومنؔ کی پہلی مثنوی کا خلاصہ فنّی لحاظ سے دیکھئے تو اس مثنوی میں بعض حصے بڑے خوبصورت اور جاندار ہیں۔ جن میں نفسیاتی کیفیات کی تصویر کشی بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے۔ مثلاً محبوب کی یاد میں جذباتی طغیانی آنکھوں کے راستے ظاہر ہونے کا موقع تلاش کرتی ہے یا جُدائی کے عالم میں جو دل میں ٹیس اُٹھتی ہے یا وصل میں جو سرخوشی اور مدہوشی غالب ہوتی ہے یا تمنائے وصل میں جو مبہم اشارے اُمید کے دئے جلاتے ہیں، یا خوفِ فراق میں ہلکی سی آہٹ سے بھی جو پریشانی اور وحشت طاری ہو جاتی ہے یا رازِ محبت کی پاسداری میں جو ضبط اور توازن قائم رکھنا پڑتا ہے یا رقابت کے شبہے میں جو خونِ جگر کرنا پڑتا ہے۔ غرض اس قسم کی قلبی واردات کی جیتی جاگتی تصویریں اس مثنوی میں اکثر ملتی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں معاملہ بندی شعری حسن کی حدود سے تجاوز کر گئی ہے جو ذوقِ سلیم کو کھٹکتی ہے لیکن غالباً اس مثنوی میں اتنی عُریانی اور جنسی بے باکی نہیں ہے یقینی کہ مومنؔ کی بعض اور مثنویوں میں یا دوسرے شعرا کی مثنویوں میں ہے۔

اس مثنوی میں کہانی کی کوئی خوبصورتی یا پلاٹ کا اچھوتا پن نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی کردار نگاری کی ندرت ہے۔ مناظر اور واقعات کو پیش کرنے میں جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے اس میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پھر بھی اس مثنوی میں اثر اور جاذبیت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مومنؔ کے ذاتی تجربات اور اُن کے اپنے محسوسات سے عبارت ہے۔ یہ مثنوی کسی دوسرے کی کہانی نہیں بلکہ آپ بیتی ہے اسی لئے اس میں جذبات کی شدّت اور گہرائی ہے۔ سوز و گداز کی گہرائی ہے اور حقیقت کی کارفرمائی ہے۔ جس سے پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ مثنوی روائتی معیار پہ پوری نہیں اُترتی، پھر بھی شاعری میں ایک پسندیدہ تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ مثنوی کیا ہے ایک آئینہ خانہ ہے۔ جس میں مومنؔ کے دور کی انفرادی اور سماجی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کے عکس دکھائی دیتے ہیں۔ اخلاقی اقدار کا انتشار ہمارے سامنے جنسی بے راہ روی کی شکل میں اُبھرتا ہے۔ معزز اور شریف خاندانوں کے افراد، مرد اور عورتیں پس پردہ نہایت لاابالی اور غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے میں جنسی زندگی میں اخلاقی ضابطوں کا جنازہ نکل گیا تھا۔ تبھی تو پردہ نشین خواتین نامحرموں کے ساتھ کُھل کھیلنے کی جرأت کر سکتی تھیں اور اس پر طرّہ یہ کہ اسے موضوعِ سخن بھی بنایا جا سکتا تھا۔ جنسی اخلاقیات اور پاکبازی کے قوانین بظاہر موجود تھے۔ ان کا ذکر بھی ہوتا تھا اور بے راہ روی سے روکنے کے لئے ان سے ڈرایا بھی جاتا تھا۔ لیکن ان قوانین کو توڑا بھی جا سکتا تھا۔ بشرطیکہ یہ چیز منظرِ عام پر نہ آئے۔ غالباً کھاتے پیتے

گھرانوں کا عام دستور عیش کوشی اور شہوت پرستی ہو گیا تھا۔ اس سے اس دور کے مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زندگی کا یہ گھناؤنا پن اس گراوٹ اور گھٹن کی غمازی کرتا ہے جو بیرونی حکومت کی جلو میں یہاں کے لوگوں پر اور بالخصوص اس طبقہ پر طاری اور ساری ہو گئی تھی جس کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار چھین لیا گیا تھا امیروں کا یہ طبقہ اتنا نکما اور شکست خوردہ ہو گیا تھا کہ اپنی محرومیوں کی تلافی گویا ہوس رانیوں، اور رنگ رلیوں کے ذریعہ کرنا چاہتا تھا۔ مومن کی یہ مثنوی اسی میلان کی آئینہ دار ہے۔

اس روشنی میں دیکھئے تو اس دور کی مثنویوں کی ان تنقیدوں کا نقطۂ نظر کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا، جو مثنوی میں بیان کی ہوئی جنسی واردات کو عورت کی نفسیاتی کمزوریوں پر محمول کرتے ہیں۔ اس قسم کی تنقید میں عورت کے خلاف عصبیت کی بو آتی ہے۔ دراصل مرد اور عورت دونوں کی نفسیاتی تشکیل میں سماجی حالات کا بڑا دخل ہے چناں چہ کسی مثنوی میں جو بھی واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان کی توجیہہ عورت کی نفسیاتی خصوصیات کی بناء پر نہیں کی جا سکتی بلکہ ان واقعات کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان کے سماجی پس منظر کو دیکھنا پڑے گا۔

آیئے، اب ذرا اس بات پر غور کریں کہ اس مثنوی سے مومن کی شخصی زندگی کے کن پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ جن سے ان کی شاعری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے عشق و محبت کے جن تجربات اور واقعات کا ذکر اس مثنوی میں کیا گیا ہے۔ وہ مومن کی شخصیت کی نشو و نما میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی ذہنی اور جذباتی زندگی پر ان کا اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ ان کی تمام تخلیقی کاوشوں پر یہ حاوی نظر آتا ہے۔ اس قسم کے تاثرات ظاہر کرنے کے لئے غزل سے زیادہ اور کون سی صنفِ سخن موزوں ہو سکتی تھی۔ چناں چہ مومن کے شعری سرمائے میں غزل کی سب سے زیادہ قدر و قیمت ہے۔ ان کی غزل میں جو "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" والی بات ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک ایسی سچائی کی مظہر ہے۔ جو صرف ذاتی تجربے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ دوسروں کے تجربے اور علم کی بناء جو شاعری کی جاتی ہے اس میں دل کو چھونے والی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ مومن کے بہت سے اشعار اتنے مقبول ہوئے ہیں کہ وہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ انھوں نے جو کہا ہے سو ڈوب کے کہا ہے۔ مومن کی شاعری میں جو نکھار اور رچاؤ ہے، جو شگفتگی اور دردمندی ہے جو ہمہ گیری اور کشش ہے وہ بڑی حد تک ان کے ان تجربوں کی رہینِ منت ہے۔ جن سے وہ دنیائے عاشقی میں دوچار ہوئے۔

مومن کی اس مثنوی سے ایک اور بات ظاہر ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے مومن کی شاعری کو اتنا وقار حاصل ہوا۔ مومن کی زندگی فارغ البالی کی زندگی تھی۔ ان کے مادّی وسائل ایسے تھے کہ انھیں اپنی معاش کے لئے کسی دربار کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوئی اور اس لئے فرمائشی شاعری کی کاوش سے ان کا دامن پاک رہا۔ جن شعراء کو مشقِ سخن پیٹ پالنے کے لئے کرنی پڑتی ہے ان کے ہاں آمد کا ہونا لازمی نہیں۔ اس کے برعکس مومن نے کسی خارجی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے شاعری نہیں کی۔ بلکہ ان کی شاعری کی محرک ان کی اپنی داخلی کیفیت تھی۔ تبھی تو ان کے اشعار میں برجستگی اور اثر ہے، بلا کا جادو ہے۔

غلام ربّانی تاباں

## غزل

وہ روشنی کہ بقیدِ سحر نہیں اے دوست
ترا جمال ہے میری نظر نہیں اے دوست

ترے بغیر وہ شام و سحر نہیں اے دوست
کوئی چراغ سرِ رہگزر نہیں اے دوست

شبِ فراق یہ محویتوں کا عالم ہے
کسی کی ہائے کسی کو خبر نہیں اے دوست

مہ و نجوم بھی گرمِ سفر تو ہیں لیکن
کوئی بھی ان میں مرا ہمسفر نہیں اے دوست

کبھی اُدھر سے جو گزرے تو سرسری گزرے
سوادِ طور تری رہگزر نہیں اے دوست

ترس نہ کھا تو غریقِ ستم سمجھ کے مجھے
ابھی مرا سرِ دامن بھی تر نہیں اے دوست

بہانہ ڈھونڈ لیا تجھ سے بات کرنے کا
کچھ اور مقصدِ عرضِ ہنر نہیں اے دوست

ارشاد حسین اظہر

# جنگِ آزادی

اے خوشا دورِ اسیری کی وسیع النظری
سر میں سودائے وطن قلب میں حب الوطنی

گُنگ جذبات کو جب شورشِ آواز ملی
جب بندھے بازوؤں کو قوتِ پرواز ملی

جب پسی حسرتِ دل ہاتھ میں تلوار بنی
جب دبی طبع رواں تیغ کی جھنکار بنی

جب گری برقِ وفا آتشِ سوزاں بن کر
گرجی آوازِ وطن شیرِ نیستاں بن کر

پا گئے برّشِ تیغ اپنے وطن کے ناخن
دستِ شل پا گئے جب طاقتِ بھیم و ارجن

تنِ مفلوجِ وطن پھر سے ہُوا شیرِ ژیاں
اپنا ہر فردِ وطن بن گیا ٹیپو سُلطاں

عزمِ محکم کا یہ اعجاز، یہ مردم سازی
اپنے محلوں سے نکل آئی تھی رانی جھانسی

دلِ نازک میں فقط حبِّ وطن کا اک غم
خمِ ابروئے وطن سازیٔ تلوار کا خم

جوہرِ قلب عیاں تیغ کا جوہر بن کر
ہمّتِ قلب نمایاں ہوئی تیور بن کر

چُوڑیوں کی نہ رہی ساعدِ سیمیں کو ہوس
تیغ و شمشیر کے قبضہ پہ تھا دستِ نُورس

نازنیں جسم سپاہی کی طرح اسپ سوار
زلف بل کھائی ہوئی ہاتھ میں ننگی تلوار

قلبِ نازک میں جو پامردی کے جوہر بھر دے
واہ رے عزمِ جواں گوشت کو پتھّر کر دے

جب تقاضائے وطن ہو یونہیں پھر نام کریں
عورتیں تانتیا ٹوپے کی طرح مرد بنیں

وہ بہادر صفِ جنگاہ میں جو شیرِ ببر
سایۂ تیغ میں جس کے تھی رواں فتح و ظفر

یادِ ماضی سے طلب کیجئے مستی و سرور
بھول سکتا ہے کوئی اہلِ وطن جنگِ بٹھور

جذبۂ حبِّ وطن، شیوۂ حبّ الوطنی
سبھی سرشارِ مئے عشقِ وطن، دل کے غنی

بیلی گارد پہ کبھی صاعقہ بن بن کے گرے
سورما قلب چلے توپ کے گولے بن کے

لختِ دل دے کے وطن دوست وفاکوشش ہوئی
بیگمِ پردہ نشیں مردوں کے ہم دوش ہوئی

عشقِ آزادی نے بچے کو جواں سال کیا
سر پہ کانٹوں سے بھرا تاجِ طرحدار دھرا

عشق کے جذبہ سے تھے پیر جواں بارِ دگر
تختِ دلّی پہ نظر آتے تھے پھر شاہِ ظفر

باعثِ فخرِ جہاں اک تھا یہاں بھی یارو
بسیواڑہ کا جواں مرد وہ بینی مادھو

جانِ اربابِ وفا، روحِ وفا، شانِ وفا
گوہرِ کانِ وفا، آنِ وفا، جانِ وفا

دہرِ فانی میں ہراک چیز ہے آنی جانی
ہاں مگر عشق کی پروانہ صفت قربانی

نام باقی ہے جو منصور سرِ دار کھنچے
نامِ عیسیٰ کو بقا ہے کہ وہ سولی پہ چڑھے

نام باقی ہے جو مخلوق کی خاطر جاں دی
لیتے ہیں فخر سے ہم نام حسین ابنِ علی

ہاں بھگت سنگھ ہیں برگِ گلِ گلزارِ وطن
سرخیٔ خونِ وفا غازۂ رخسارِ وطن

وہ محمدؐ علی وہ اجمل و انصاری و بوس
جن کے قدموں سے خرد آنکھ ملے ہو پابوس

بوس کے نام سے آباد ہے ہر خانۂ دل
ان کی خوشبو سے معطّر ہُوا کاشانۂ دل

کڑکے بجلی کی طرح چھا گئے آندھی بن کر
ولولے ہند کے بڑھتے گئے گاندھی بن کر

شوق سے پار ہوئی منزلِ تیغ و گردن
ہم پہ آسان ہُوا مرحلۂ دار و رسن

ان کے صدقے ہی وطن کا یہ نیا دَور چلا
صبحِ مشرق میں ہوئی ہند کا تارا چمکا

وہ مرا قافلہ سالار جواہر نہرو
نیک دل، نیک سیر، نیک اساس و خوش رو

سایۂ چترِ جواہر میں سبک یار چلو
سر پہ کج رکھ کے کُلہ بن کے طرحدار چلو

مسکراہٹ سی لبِ اہلِ وطن پر آئی
سینۂ ہند میں لیتا ہے شباب انگڑائی

انقلاب اب بھی مگر دیتا ہے آواز تمہیں
ابھی کرنا ہے "فلک مرتبہ" پرواز تمہیں

لغزشِ پا کو سنبھالو کہیں ٹھوکر نہ لگے
اتحاد و عمل و عزم رہو ساتھ لئے

دیکھو سرشارِ مئے عشرت و نخوت نہ بنو
دیکھو آشفتۂ لیلائے عداوت نہ بنو

ہو مبارک تمھیں اے اہلِ وطن دورِ جدید
ابھی "وارفتگیٔ عشق" کی حاجت ہے شدید

یوں سنور جاؤ کوئی ہمسر و ثانی نہ رہے
اور افلاس کی خونناب فشانی نہ رہے

رضیہ سجاد ظہیر

# اپنی بار

کھُرپی چلاتے چلاتے منصور ہانپنے لگا تھا۔ لیکن کھُرپی رکھ کے اُس نے اطمینان کی ٹھنڈی سانس بھری۔ آدھی سے زیادہ کیاری مکمل ہو چکی تھی۔ جتنی باقی تھی اتنی اور ہو جائے تو پھر اس میں بیلے کی قلم بڑی آسانی سے بٹھائی جا سکے گی۔ سر اٹھا کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، چاروں طرف کیاریوں میں بہار کے پھول بھرے ہوئے تھے۔ مٹر میں طرح طرح کے رنگ سورج کی روشنی میں کھُلتے جا رہے تھے۔ بڑی بڑی پنیریوں سے لدے ہوئے گملے، رنگ بھری ہوئی تصویروں کی طرح نظر آتے تھے۔ گلاب کی کیاری میں نیچے پڑی ہوئی سُوکھی پنکھڑیاں مُرجھا رہی تھیں تو پودوں کی پھننگوں میں بہت سی کلیاں شرمائی لجائی اپنا سر اٹھا رہی تھیں ــــ ایک سفید کلی کے کولھوں کا گھُوم تو اتنا گداز تھا کہ شائد مٹھی میں نہ آتا اور پتلی سی نوک کمر کی طرح سیدھی اور مہین تھی! کلی کے آس پاس منڈلاتی ہوئی، دُھوپ سے چمکتی تتلی کو دیکھ کر منصور کا دل بے قرار ہو اٹھا۔ دُور کہیں سے کوئل کی بھی تو آواز آ رہی تھی اور ہوا میں آم کے بور کی سوندھی خوشبو رچی ہوئی تھی ــــ تو گویا بہار آ ہی گئی تھی!

کھڑے ہو کر ہاتھوں سے مٹی جھاڑی اور تیزی سے گھر میں گھس گیا ــــ صفیہ کو بُلا کر لانا چاہیئے۔ بہار کی یہ رسیلی گدرائی صبح، اپنے ننھے سے گھروندے کا یہ چھوٹا سا دلرُبا حسن ــــ بھلا اکیلے دیکھنے میں کیا لُطف!

صفیہ اندر آنگن میں مُنی کے کپڑے دھو کر پھیلا رہی تھی۔ الگنی پر ٹنگی، ہوا میں لہراتی ننھی منّی رنگ برنگی فراکیں، طرح طرح کے سوئٹر اور نہ جانے اور کیا سب کپڑے جو منصور کی سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے! وہ زور سے آواز دیتا ہوا دروازے سے داخل ہوا! "صفیہ! ــــ کہاں ہو بھئی ــــ ارے دیکھو تو سفید گلاب میں کتنی بڑی کلی آ گئی ہے ــــ ارے کہاں ہو۔ سُنو تو۔۔۔۔"

اور اس کے آگے وہ کوئل کی آواز اور تتلی کے چمکیلے رنگوں کا ذکر کرنے ہی والا تھا کہ الگنی کے پیچھے سے صفیہ کی دبی سی آواز آئی، "اے توبہ ــــ تو اس میں اتنا چیخنے کی کیا بات ہے۔ ہے کے لڑکی کو اٹھا دیا۔ ابھی نعمت خانہ صاف کرنے کو پڑا ہے۔ اب بھلا کیا کام ہو سکتا ہے۔"

اور پھر کھٹولے پر سے کُنمنانے کی آواز کے ساتھ ایک ننھا سا سر اُونچا ہوا۔ منی پلنگ پر پہلے الٹی ہوئی اور پھر دونوں پیر پٹی پر سے نیچے لٹکا کر جھٹ زمین پر کھڑی ہو گئی۔ منصور اُس کی اِس پھُرتی پر ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اُسے گود میں اٹھائے باغ کی طرف بڑھا صفیہ بڑبڑاتی ہوئی پیچھے ہو لی۔

باغ میں پہنچ کر منصور نے منی کو گود سے اُتار دیا اور صفیہ کو نئے جملتے ہوئے پودے دکھانے لگا۔ گلاب کی سفید کلی کو تو دیکھ کر صفیہ بھی مارے خوشی کے کیاری کے نزدیک بیٹھ گئی اور اُسے اُنگلی سے چھُونے لگی۔ منصور اس کی یہ دلچسپی دیکھ کر وہیں کھڑا ہو گیا اور اُسے بتانے لگا۔ "اور ہمارے پنیریوں میں جو اتنے بڑے پھول آتے ہیں اس کی وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک ایک گملے میں الگ الگ ایک ایک پودا بویا گیا ــــ آؤ پنیری دیکھو ــــ ویسے یہ بھی بات ہے کہ اِدھر کے حصّے پر سورج کی روشنی زیادہ پڑتی ہے ــــ اور یہ حصّہ اس آم کے درخت کی وجہ سے۔۔۔۔" پھر وہ پنیری کے گملوں کی طرف مڑا اور ایک زور کی چیخ ماری۔ "اُفوہ ــــ ارے مار ڈالا ہا کم بخت" ــــ صفیہ گھبرا کے دوڑی۔ مُنّی کے دونوں ہاتھوں میں پنیری کے چار پانچ اُکھڑے ہوئے پودے، گردنیں لٹکائے، نظر آ رہے تھے: چاروں طرف زمین پر بھی پھولوں کی نُچی ہوئی پنکھڑیاں بکھری پڑی تھیں ــــ اور مُنّی نہایت فتح مندانہ انداز میں تنی ہوئی گملوں کے پاس کھڑی تھی۔

منصور نے لپک کر اس کے ہاتھ سے پودے چھین کر زمین پر پٹخ دیئے اور ایک زنّاٹے کا طمانچہ اُس کے گال پر رسید کیا۔ چار اُنگلیوں کا لال نشان، گورے سفید گال پر بنتے ہی مُنّی کیاری میں گری اور صفیہ دوڑ کر مُنّی پر گری "ہاں ہاں مار ڈالو — چھوڑ کیوں دیا، چولھے بھاڑ میں جائیں تمھارے یہ پھول، لوکا لگے اس باغ کو — واہ — کیا تڑسے دے مارا جیسے آپ ہی نے تو درد کھا کر پیدا کیا ہے — غارت ہو جائے تمھاری باغبانی — بچّی کا دم نکال دیا لے کے"

مُنّی ابھی تک سانس روکے تھی!

منصور غصّے سے ابھی تک کانپ رہا تھا۔ "لے جاؤ اس پلّی کو یہاں سے، ورنہ پر سچ مچ جان نکال دوں گا کتنی محنت پر پانی پھیر دیا، جنگلی ..."

"آ ہا ہا — بڑے آئے جان نکالنے والے، کچھ عقل ماری گئی ہے، بھلا وہ معصوم کیا جانے تمھارے ان اُجڑے پھولوں کو کہ کیا ہیں، کیا نہیں ہیں — واہ رے واہ — ہاتھ لگا کے دیکھو ذرا — اگر ان گھاس پھوس کو جڑ سے اکھاڑ کے نہ پھینک دوں تبھی کہنا — ہاں نہیں تو ...."

صفیہ بیٹی کو گود میں اٹھائے بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی — مُنّی ماں کے کندھے پر سے بار بار سر اُٹھا کر ہچکی لیتی ہوئی، غصّے میں بھرے ہوئے باپ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے ...

سنیچر کے دن منصور ہمیشہ دفتر سے جلدی آجایا کرتا تھا۔ ذرا دیر گھر میں بیٹھتا اور پھر دونوں بچّی کو لے کر باہر کو جانے کا پروگرام بناتے تھے۔ اُس دن چائے اکثر باہر ہی پی جاتی تھی۔

لیکن آج منصور گھر آیا، بائیسکل گیلری میں کھڑی کی، اندر جا کر کپڑے بھی بدل لئے، نہا بھی لیا لیکن اُسے صفیہ نظر نہ آئی۔ حالاں کہ سنیچر کے دن اُسے صفیہ تیار ملتی تھی۔ کھانے کی میز پر ناشتے کے برتن لگے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ صفیہ نے ناشتہ گھر میں ہی کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن وہ ابھی کمرے سے برآمد نہیں ہوئی تھی، بچّی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ صفیہ کے کمرے میں پہنچا تو اُسے کچھ بڑبڑانے کی آواز دروازے کے پاس ہی سے آنے لگی۔ جھانک کر دیکھا تو صفیہ پلنگ کے پاس لگی ہوئی کُرسی پر بیٹھی تھی اُس کے گھٹنوں پر ایک رسالہ کھُلا ہوا رکھا تھا اور وہ بڑی تیزی سے سلائی کی تیلیاں چلاتی ہوئی کہتی جا رہی تھی "دو اُلٹے، دو سیدھے اُدن آگے — ہوں — پھر — دو اکٹھے، ایک سیدھا، دو...."

"اُفوہ" منصور کمرہ میں آگیا "آج چائے واے نہیں ہوگی، کہیں جایا نہیں جائے گا، یا بس یہ اُلٹے، سیدھے ہی ہوتے رہیں گے — مُنّی کہاں ہے"

"ارے تم آگئے" صفیہ نے رسالے پر سے نظر اٹھائے بغیر کہا

"جی نہیں ابھی کہاں آیا۔ ابھی تو دفتر ہی میں ہوں بھئی اس کو اٹھاؤ نہ۔ چار بجنے کو آ رہے ہیں" — وہ پلنگ پر ایک طرف سوئی ہوئی مُنّی کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی ہتھیلیوں پر اپنی اُنگلی رکھ کر دبانے لگا۔

"بھئی مت اس کو جگاؤ۔" صفیہ بیزاری سے بولی "جمعہ کو یہ سوئٹر پورا کر کے دینا ہے اور رفتار یہ ہے کہ چھ دن میں اب جا کے یہ آنا ہوا ہے۔ نمونہ ہی مسز سُوری نے ایسا اللہ کا سنوارا چُن کے دیا ہے — اور سنیچر کو مینا بازار ہے"

"تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ آج ہم لوگ کہیں نہیں جا سکتے۔"

"ہاں — بالکل یہی معنی ہوئے" — اور پھر وہ اُلٹا سیدھا گننے لگی۔

"تو چل کے چائے تو پیو — لو یہ اُٹھ گئیں۔ ان کو بھی وہیں میز پر لے چلتے ہیں — کیوں؟"

"اُفوہ — آخر تم نے اسے اٹھا کر ہی دم لیا۔ اچھا لے چلو"

منصور نے بیٹی کو گود میں اٹھا لیا اور دونوں چائے کی میز پر جا بیٹھے، مُنّی کو منصور نے گود سے اُتارا تو وہ پہلے میز کے نیچے پہنچیں۔ ابّا کے جوتے کا فیتہ پکڑ کر کھینچا — وہ کھُل گیا۔ زور سے ہنسیں۔ پھر نیچے ہی نیچے آگے جا کر ماں کی کُرسی کا ہتّھا پکڑا۔ صفیہ نے نمک پارے کا ایک ٹکڑا اُن کے مُنھ میں دے دیا۔ کھاتی ہوئی، لڑکھڑاتی ہوئی وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ ماں باپ ناشتے میں مصروف ہوگئے!

"تو پھر تم نہیں چل رہیں؟" منصور نے چائے ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی — میں تو بس پٹنگ شروع کرتی ہوں" صفیہ نے جواب دیا۔

"تو میں ذرا گنج تک ہوتا آؤں — میری چھڑی تو شاید تمھارے کمرے میں ہے"

"ہاں وہیں ہے۔ کیا پیدل جاؤ گے؟"

"ہاں ذرا اس وقت پیدل کا ہی موڈ ہے۔"

"اچھا تو آؤ لے لو چھڑی — اور دیکھو — پانڈے جی اگر ملیں تو اُن سے کہنا کہ وہ بجلی کا مستری اب تک پنکھا نہیں دے گیا"

جیسے ہی دونوں کمرے میں داخل ہوئے، صفیہ ایک دم چیخ پڑی جیسے اُسے بچھو نے یکایک ڈنک مار دیا ہو! سامنے مُنّی فرش پر گول گول چکّر کاٹ رہی تھی ریل کا انجن بنی ہوئی، چھک چھک، چھک چھک — اس کے ہاتھ میں گلابی اون تھا

سلائیاں الگ پڑی تھیں، اور زمین پر پڑے ہوئے ناچتے ہوئے سوئٹر سے اُون کھینچتا چلا آ رہا تھا ـــــ چاروں طرف، اُون کے کھلے ہوئے لچھے بڑھیا کے بال کی طرح، اکٹھے اکٹھے پڑے تھے اور تمام فرش پر گلابی اون کا کراس ورڈ معمّہ بنا ہوا تھا ـــــ صفیہ نے جھپٹ کر مُنّی کو ایک زور کا طمانچہ رسید کیا وہ دیوار پر گری، اون ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ایک زور کی چیخ سُنائی دی۔ منصور نے لپک کر منی کو گود میں اٹھا لیا اور اُس کا سر سہلانے لگا۔ "اُفوہ ـــــ کتنی ظالم ہو تم، اتنی زور سے اسکو دھکا دیا، وہ تو کہو بچ گئی ورنہ سر پھٹ کے مر گئی ہوتی۔ جان نکل گئی ہوتی اس کی ..... واہ ـــــ اچھی نٹنگ ہے کہ بچی کی جان ..."

غصّے کے مارے صفیہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔ "لے جاؤ اس کو یہاں ورنہ میں سچ مچ جان نکال دوں گی۔"

"اوہو ـــ بڑی آئیں جان نکالنے والی ـــــ جیسے ڈولی میں بٹھا کے تو لائی تھیں ـــــ تم بیٹھ کے کرو اپنا اُلٹا سیدھا ـــ چل بیٹی۔ ہم تو اپنی منی بیٹی کو سائیکل کی ٹوکری میں بٹھا کے گھنج لے جائیں گے۔ ان کی تو عقل ماری گئی ہے میری بیٹی، میری دُلاری ..."

منصور نے بیٹی کو کندھے سے لگا لیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

مُنّی باپ کے کندھے پر سے سر اٹھا کر، ہچکیاں لیتی ہوئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غصّے میں بھنّائی ہوئی ماں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے .....

---

1957

## صنعتی کوآپریٹو سوسائٹیاں

بھارت سرکار کی مالی امداد سے اس مالی سال میں ملک کے مختلف علاقوں میں گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقّی کے لئے بہت سی صنعتی کوآپریٹو انڈسٹریل سوسائٹیاں قائم کی جا رہی ہیں۔

گذشتہ تین سالوں میں ایسی سوسائٹیاں قائم کرنے کے لئے کافی امداد دی گئی۔ تاکہ کارکن اپنی صنعت کی کمائی سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں۔ مرکز نے ریاستی سرکاروں کو عطیے اور قرض دیئے تاکہ وہ کاریگروں کو امدادِ باہمی کی انجمن بنانے کے لئے امداد دے سکیں۔ ریاستی سرکاروں کو اس مقصد کے لئے بھی قرض دیا جاتا ہے کہ وہ اسے کوآپریٹو سوسائٹیوں کے اخراجات کے لئے تقسیم کر سکیں۔ اس قرض کی رقم پر کم سود لیا جاتا ہے۔

چالو مالی سال میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لئے کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کرنے کی خاطر ۱۶ اسکیمیں منظور کی گئی ہیں۔ ان اسکیموں کے تحت بٹالہ (پنجاب) میں سٹوریج بیٹریاں اور ڈھلائی شدہ ربڑ کی چیزیں تیار کرنے کی کوآپریٹو سوسائٹی قائم ہوگی جب کہ شری پدم بودر (مدراس) میں چھتنیاں اور قیچی بنانے کی اور ڈنڈی گل (مدراس) میں چمڑے کا کام کرنے نیز تالے بنانے والوں کے لئے بھی سوسائٹیاں قائم کی جائیں گی۔ مدراس میں چمڑے کے کام سے متعلق ایک اور سوسائٹی کی [illegible] سرے سے تنظیم کی جائے گی۔ مدراس اور پنجاب میں امداد کے طور پر بھارت سرکار ۳ لاکھ ۳۰ ہزار روپے دے گی۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں دستی کرگھوں کی صنعتی کوآپریٹو بنانے کی اسکیمیں منظور کی گئیں۔ ان کے تحت بمبئی میں شولاپور مدراس میں مدورائے کارور اور ویلوکوٹا بہار میں بہار شریف اور مدھوبانی اور کیرالہ میں ترم ونڈرم کے مقامات پر سوسائٹیاں قائم ہوں گی۔ علاوہ ازیں کئی اور کوآپریٹو سوسائٹیاں بنائی جائیں گی ان کو قرض اور عطیے کی [illegible]رت میں مرکزی سرکار نو لاکھ سے بھی زیادہ کی رقم دے گی۔

### سلک کوآپریٹوز

سلک کے لئے تا حال سولہ صنعتی کوآپریٹوز قائم ہو چکی ہیں اور ان کے لئے تیرہ لاکھ روپے کی مالی امداد منظور کی گئی ہے۔

ریاستی سرکاروں اور آل انڈیا ہینڈی کرافٹس بورڈ کی سفارشوں پر دستکاریوں کے لئے ۱۶ کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کرنے کی منظوری دی گئی ہے ان کے چھ لاکھ ۵۸ ہزار روپیہ بطور عطیہ دیا جائے گا۔ اور تیرہ لاکھ ۳۹ ہزار روپیہ بطور قرض۔

عبد السلام نعمانی

# کاشی یا بنارس

۵ ہزار یا اس سے بھی زیادہ برس بیتے جب گنگا کے کنارے کی یہ دھرتی نیم متمدن قوموں کی ایک گنجان آبادی کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھی۔ اور اس وقت آریوں نے پنجاب سے نکل کر گنگا اور جمنا کے کنارے آباد ہونا شروع کیا تھا۔ یہ مقدس سرزمین معلوم نہیں کتنی سلطنتوں کو اُبھرتے اور بنتے دیکھ چکی تھی۔ اور کتنے پُرشوں، مہاپرشوں نے اس دھرتی پر جنم لیا، اور کاشی نگری کی آغوش میں پروان چڑھے۔

کاشی کی اہمیت کا اندازہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ آج بھی یہاں بھگوان بدھ کے امن و اہنسا کے پیغام کی جوت جل رہی ہے۔ یہ شاید لفظ کاشی کی برکت ہے جو سنسکرت لفظ "کاش" سے بنا ہے۔ جس کے معنی درخشاں اور روشنی کے ہیں۔ یہ صرف لفظی ہی نہیں بلکہ معنوی اعتبار سے ایک حقیقت رکھتا ہے۔ کاشی سچی معرفت اور نور حاصل کرنے کے لئے ایک بہترین جگہ ہے جس کی تصدیق کاشی کھنڈ اور اُپنشدوں (کتب وید) سے ہوتی ہے۔

موجودہ کاشی یا بنارس (وارانسی) برنا اور اسی کے درمیان تقریباً ۷ میل کی لمبائی میں گنگا کے شمالی کنارے پر ہلالی شکل میں آباد ہے۔ شاید اسی بنا پر سنسکرت کا دوسرا نام 'دھنک آکار' بھی ہے۔ یہ نام پُرانے زمانے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ برنا اور اسی کے درمیان آباد ہونے کے باعث یہ شہر برناسی (وارانسی) کے نام سے موسوم ہوا جو عرف عام میں بنارس کہا جانے لگا۔ زمانہ گذشتہ میں جو تاریخیں مرتب ہوئیں اُن میں بھی بنارس کا تذکرہ وارانسی ہی کے نام[1] سے ہے

کاشی کی قدامت میں کسی کو شُبہ نہیں۔ تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ دُنیا کا قدیم شہر ہے۔ یہاں تک کہ "ویوسوت منو" یعنی حضرت نوح کے وقت سے آباد ہونا بتایا جاتا ہے۔ تاریخ فرشتہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کی قدامت کے بارے میں ایک انگریز سیّاح لکھتا ہے۔ "اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کاشی کب آباد ہوا تو ہمالیہ پہاڑ کے وجود میں آنے کا حال معلوم ہو جائے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مُصنفین نے زمانہ قدیم ہی سے کاشی کی تاریخ پر مستقل قلم اُٹھایا ہی نہیں ہے اور کاشی جی کی تاریخ اور اہمیت کا پتہ لگانے والوں کے لئے بجز کاشی کھنڈ کے اور کوئی ذخیرہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالات بڑی تاریکی میں ہیں پانچویں صدی ہجری میں جب ابوریحان البیرونی ہند کا سفر کرنے آیا تو اس نے بنارس کا بھی دورہ کیا اور عربی زبان میں کتاب الہند کے نام سے اپنا سفرنامہ مرتّب کیا۔ اس کے مطالعہ سے اس وقت یہاں کی تہذیب و تمدّن سے متعلق حالات معلوم ہوتے ہیں۔ یہی ابوریحان البیرونی سلطان محمود غزنوی کا ہمعصر تھا جس نے ہندوستان میں سالہا سال رہ کر یہاں کے علوم و فنون اور مختلف زبانوں کو سیکھا تھا۔ چنانچہ بنارس میں اس وقت قیام کرنے کے بعد یہاں کی زبان کے متعلق بھی اس نے لکھا ہے:۔

"ہندی خط بائیں طرف سے چلتا ہے۔ اور مشہور رسم خط کا نام سدھ ماترک ہے جو کشمیر کی طرف عموماً منسوب ہے اور یہی بنارس میں جاری ہے۔"

افسوس ہے کہ ابوریحان البیرونی نے سارناتھ جیسی اہم اور تاریخی جگہ سے متعلق کوئی نشان دہی نہیں کی ہے۔ اور یہ جگہ اب موجودہ بنارس سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں بھگوان بدھ کی تعلیمی خانقاہیں تھیں۔ جن کی کثرت تھی جو ایک عرصہ دراز گذر جانے کے باعث زمین کے اندر دب گئی ہیں اور اب گورنمنٹ کے حکم سے

---

[1] ہیچ نامہ قلمی (کتب خانہ دار المصنفین اعظم گڑھ) میں بھی بنارس کا تذکرہ وارانسی ہی کے نام سے ہے۔ صفحہ ۲۳

کھود کھود کر نمایاں کی جا رہی ہیں۔ ان تعلیمی خانقاہوں کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر سے فرامین بھی برآمد ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان بدھ کی تعلیمات کی اشاعت کے لئے بہار اور ہندوستان سے باہر تک نمائندے گئے ہوئے تھے۔ اس کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ اس قسم کی خانقاہوں کو یہ لوگ وِیہار کہتے تھے جو ہندی لفظ ہے۔ بخارا جو مشرقی ممالک کا علمی و اسلامی مرکز تھا۔ اسی وِیہار کا دوسرا تلفظ ہے، جیسا کہ سرحدی پٹھان ہمیشہ ح کو خ سے ادا کرتے ہیں۔ بلخ کا مشہور تاریخی شہر "نوبہار" بھی بودھ مذہب ہی کی خانقاہ کا نام تھا۔

سارناتھ میں زمین کے اندر سے جو کتبے دستیاب ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے تقریباً ۳۰۰ سال قبل یہ شہر مہاراجہ اشوک کے قبضے میں تھا اس کے فرمان جو ہندوستان کے مختلف مقامات پر ستونوں میں کندہ پائے جاتے ہیں یہاں بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ بہت سے کتبے سارناتھ کے میوزیم میں حفاظت سے محفوظ ہیں[1]۔

سارناتھ کا بلند گنبد راجہ اشوک کے عہد میں تعمیر ہوا۔ یہ عرف عام میں دھمکوا کے نام سے مشہور ہے۔ اس گنبد کی موجودہ اونچائی ۹۰ فٹ اور چوڑائی ۳۰۰ فٹ ہے۔ اس کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ سن عیسوی سے ۴۴۳ سال قبل شاکیہ منی (پیشوائے بدھ) نے رحلت کی تو بودھوں کے راجہ نے یہ خواہش کی کہ شاکیہ منی کی لاش کو اپنے راج کی سرزمین میں لے جا کر عبادت گاہ بنائی جائے۔ اس خواہش پر اختلاف رائے ہوا اور راجاؤں میں خوب لڑائی ہوئی۔ آخر کار یہ طے پایا کہ شاکیہ منی کی لاش کو جلا کر ہڈی اور راکھ تھوڑی تھوڑی تمام راجاؤں میں تقسیم کر دی جائے۔ لاش جلائی گئی اور ہر ایک راجہ نے اس ہڈی اور راکھ کو ایک ڈبہ میں بند کر کے اس طرح کا ایک گنبد بنوایا ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جہاں اس قسم کا گنبد ہے اس کو اسی واقعہ کی یادگار سمجھنا چاہیئے۔

یہ واقعہ عام طور سے مشہور ہے اور [illegible] افواہ ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ جس کی تصدیق تاریخوں سے ہوتی ہے اور یوں بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ مسٹر جیمس پرنسپل سابق کوئنس کالج بنارس نے اس گنبد کو کھدوایا تھا تو ایک ڈبہ جس میں ہڈی اور راکھ تھی دستیاب ہوا اور سونے اور چاندی کے کچھ سکے بھی ملے۔ ایک پتھر بھی ملا جس میں اُس زمانے کے مروجہ حروف کندہ تھے جو پڑھے نہیں جا سکے۔ یہ چیزیں گورنمنٹ کالج بنارس میں رکھی ہوئی ہیں۔

راجہ اشوک کے بعد حکومت زوال پذیر ہوتی گئی اور سن عیسوی سے ۱۰۰ سال قبل بنارس کی سلطنت مہاراج کنشک کے قبضے میں تھی اس کے مکانات کے نشانات بھی زمین کے اندر کھودنے سے ظاہر ہوئے ہیں۔ مہاراج کنشک کی حکومت دُور تک تھی اور اس کا تعلق زیادہ تر یونانی بادشاہوں سے رہا۔ بلکہ بعض مؤرخ اس کو یونانی نسل سے ہونا ظاہر کرتے ہیں۔

مسیح کے بعد بنارس کے حالات تاریکی میں ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہاراج کنشک کے بعد حکومت پوری طرح زوال پذیر ہو رہی تھی اور مہاراجہ بکرماجیت نے بنارس کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس عہد کا کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں ہے۔

سارناتھ کے قدیم آثار میں "گنبد ہمایوں" ایک قابل دید چیز ہے جو عوام میں "سیتا کی رسوئی" کے نام سے مشہور ہے اس کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۹۶۹ھ میں یہ گنبد ہمایوں نے اپنے خادم خاص گوبردھن کی یادگار میں تعمیر کرایا۔ یہ ایک پہاڑی نما ٹیلے پر کافی بلندی پر واقع ہے۔ بنارس میں اس سے اونچی کوئی عمارت نہیں ہے۔ اس کے دروازے پر یہ کتبہ لگا ہے:۔

| | |
|---|---|
| چو ایں جا شاہ جنّت آشیانی | ہمایوں بادشاہِ ہفت کشور |
| بروزے آمد و بر تخت بنشست | ازاں شد مطلع خورشید انور |
| گوبردھن بندہ را آمد بہ خاطر | غلامِ خانہ زاد شاہ اکبر |
| کہ سازد جائے گی بہر تبرک | معلّا گنبدے چوں چرخ اخضر |
| نود شش سال و نہ صد بود تاریخ | کہ آمد ایں بنائے خوب منظر |

کاشی صرف قدیم تاریخی آثار ہی کا شہر نہیں۔ بلکہ ایک مقدس تیرتھ گاہ ہے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے یاترا کرنے والے عقیدت مندوں کی قبلہ گاہ ہے۔ صرف علمِ باطن ہی نہیں، بلکہ علومِ ظاہری کی تحصیل و تکمیل بھی کاشی جی کی آغوش میں ہوتی ہے فیضی اکبر کا مشہور درباری عالم کاشی آیا اور برہمن بچہ بن کر بنارس کے مشہور ودیالیہ میں داخل ہو گیا اور علم سنسکرت میں کمال حاصل کیا۔ گیارہویں صدی ہجری میں سید نظام الدین بلگرامی نے سنسکرت حاصل کرنے کے لئے بنارس کا سفر کیا اور یہاں رہ کر اس علم کی تکمیل کی۔

یہ عزت صرف کاشی ہی کو حاصل ہے کہ اگر ایک طرف ہندوؤں کو کاشی جی

---

[1] زمین کے اندر سے چار شیروں کا جو ستون برآمد ہوا ہے وہ بھی سارناتھ کے میوزیم میں محفوظ ہے۔ جو اشوک کے عدل و انصاف اور اس کی نیکی اور ہمہ دوستی کا آئینہ دار ہے۔

اور اپنے علم پر ناز ہے اور یہ اُن کی مقدس تیرتھ گاہ ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کا بھی علمی، ادبی، تاریخی، تمدّنی مرکز رہ چکا ہے۔ حزیں ایران کا زندہ دل شاعر نادر شاہ کے حملوں سے ترکِ وطن کے بعد ہندوستان آیا۔ اور ہندوستان کے مختلف تہذیبی اور ثقافتی مرکز دہلی، لاہور، ملتان ہوتا ہوا بنارس پہنچا اور یہاں کے ذرّہ ذرّہ سے اسے والہانہ محبت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ اس کا یہ شعر آج بھی اہلِ ذوق حضرات میں زبان زد ہے۔

از بنارس نروم معبد عام است اینجا ہر برہمن پسرے لچھمن و رام ست اینجا

حزیں آج بھی بنارس ہی کی آغوش میں لیٹا ہوا ہے اور اس کے یہ اشعار زبانِ حال کی ترجمانی کر رہے ہیں جو اس کی لوح مزار پر کندہ ہیں۔

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم سرِ شوریدہ بر بالین آسائش رسید اینجا
زبان دانِ محبت بودہ ام دیگر نمی دانم ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

صبحِ بنارس آج بھی اپنی سابقہ روایات کے ساتھ قائم ہے اور اپنے اندر جلوہ سامانیاں لئے ہوئے زائرین کا مرجع ہے۔ گنگا جی کا اشنان کرنے والے دُور دُور کے زائرین اپنے گناہوں سے پاک ہوتے ہیں اور کاشی جی کو اپنی عقیدت کے نذرانے پیش کرتے ہیں

حزیں نے اسی صبحِ بنارس کا ایک نقشہ کھینچا ہے۔

پری رخانِ بنارس ہزار رنگا رنگ پئے پرستش مادہو سحر کنند لب گنگ

مرزا غالب جب بنارس آئے تو اسی صبحِ بنارس کا ایک نقشہ دیکھ کر ایک پوری نظم تیار کر دی جو اہلِ ذوق کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے:-

تعالی اللہ بنارس چشم بد دُور بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور
عبادت خانۂ ناقوسیاں است ہمانا کعبۂ ہندوستان است
بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور سراپا نور ایزد چشم بد دُور
میانہا نازک و دلہا توانا ز نادانی بہ کارِ خویش دانا
تبسّم بس کہ در لبہا طبیعی ست دہن ہا رشکِ گلہائے ربیعی ست
ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار خرامے صد قیامت فتنہ دربار
بہ لُطف از موجِ گوہر نرم رَوتر بناز از خونِ عاشق گرم رَوتر
ز انگیزِ قد انداز خرامے بپائے گلبنے گستردہ دامے
ز رنگیں جلوہ ہا غارت گرِ ہوش ... .... ... ... ...
ز تابِ جلوۂ خویش آتش افروز میان بُت پرست و برہمن سوز
قیامت قامتاں مژگاں درازاں ز مژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں
بہ تن سرمایۂ افزائشِ دل سراپا مژدۂ آسائشِ دل
بہ مستی موج را فرمودہ آرام ز نغزی آب را بخشندہ اندام
فتادہ شورشے در قالبِ آب ز ماہے صد دلش در سینہ بیتاب
ز بس عرضِ تمنّا می کند گنگ ز موج آغوش ہا وا می کند گنگ

ز تابِ جلوہ ہا بے تاب گشتہ
گہر ہا در صدف ہا آب گشتہ!

---

## بھارت میں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں

بھارت کے صنعتی نظام میں ایک طرف بڑے پیمانے کی منظم صنعتوں اور دوسری طرف گھریلو اور دیہاتی صنعتوں اور دستکاریوں کے مقابلے میں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں ایک الگ اور نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ چھوٹے صنعتی یونٹ زیادہ تر شہری علاقوں میں مرکوز ہیں۔ یہ بجلی اور مشینی ساز و سامان استعمال کرتے ہیں۔ بڑی صنعتوں اور ان میں صرف سائز اور کام کرنے کی صلاحیت کا ہی فرق ہوتا ہے۔ دوسرے منصوبے میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی تنظیم اور ترقی کو کافی بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ پہلے منصوبے کے عرصے میں اس کام کے لئے ۳۰ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے تھے۔ اب دوسرے منصوبے میں چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے لئے ۵۵ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔

اقبال مجید

# قبائلی قوانین کا ایک جائزہ

قبائلی تہذیب تاریخ نوشتہ کے ماضی کی یادگار ہے یہاں ہم انسان کو اُسی روپ میں دیکھتے ہیں جب وہ حیوان سے انسان بن رہا تھا۔ اور جب اس کا شعور فطرت کے چھوٹے سے چھوٹے مذاق کی بھی داد نہ دے پاتا تھا۔ اُس دَور کے انسان کی زندگی کا چشمہ بڑی سنگ لاخ زمینوں سے ہوکر گزرا ہے۔ اور یہ شیر خوار۔ بچہ فطرت جیسی ضدّی اور ہٹ دھرم انّا کی گود میں اس وقت بھی مچلتا رہا اور اپنی استعداد کے مطابق تلاش اور جستجو میں لگا رہا۔

ہر سماج خواہ وہ تہذیب کے مدارج طے کر کے کسی بلند سطح پر آگیا ہو یا ابھی پستی کی گہرائیوں میں ہو کچھ ایسے اُصول مرتّب کر لیتا ہے جن کے بغیر اس کی فلاح تشکل اور نشو و نما ناممکن ہو جاتی ہے۔ انسان ازل سے پابندیوں کا محتاج رہا ہے جن شاہراہوں پر وہ چلتا ہے انھیں کے آگے دیواریں بھی کھڑی کر دیتا ہے کبھی یہ دیوار فطرت کی طرف سے اٹھائی جاتی ہے اور کبھی اس کے اپنے ہاتھوں سے غرضیکہ اسی قید و بند میں اس کی ترقّی کا راز مخفی ہے۔ خود ہی دریا بہانا اور خود ہی بند بنانا، تہذیب نے انھیں گرہوں کا نام قانون رکھا ہے۔

قبائلی تہذیب جسے ہم انسانی تہذیب کی ابتدا کہہ سکتے ہیں۔ اس نے بھی اپنی ابتدائی راہوں میں ان پابندیوں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جو آگے بڑھ کر اس کی تقدیر بن گئی تھیں۔ دھیرے دھیرے قبائلی انسان کے تجربات نے اس کو ایک ایسا تہذیبی ورثہ سونپ دیا جس کی مدد سے اس نے اپنی طرزِ معاشرت، رسم و رواج مذہبی عقائد غرضیکہ پوری سماجی زندگی کو منظم کیا۔ اس نے نیک و بد اور خیر و شر کے درمیان حدیں کھینچنا سیکھ لیں، اور انھیں منوانے کے لئے سزا و جزا کے قوانین مرتب کئے۔ یہ جنگلی قومیں خصوصاً ہندوستان میں بہت مدت تک تہذیبی دنیا کے اثرات سے بے نیاز ہو کر اپنی روایات کی مخصوص ڈگر پر چلتی رہیں۔ ہندوستان پر حکومت کرنے والے انگریزوں کے عہد سے پیشتر کے کسی بھی حکمران نے ان وحشی قوموں کی طرف رُخ نہ کیا۔ یہ جنگلی قومیں اس زمانے میں خود مختار تھیں اور ان کا تحفظ ان کے اپنے قانون کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن تاریخی حیثیت سے اگر ہم دیکھیں تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ ان قبائلیوں کی اپنی تنظیم اس وقت درہم برہم ہوئی جب بڑی اور مہذب طاقتوں کے دلوں میں ان پر حکومت کرنے کا خیال پیدا ہوا ان میں سے پہلی طاقت انگریز قوم کی ہے جس کا بنیادی مقصد ہندوستان پر حکومت کرنا تھا۔ انگریزوں نے ان جنگلی قوموں کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اس زور آوری کا نتیجہ ظاہر تھا، قبائلی تہذیب میں ایک افراتفری پھیل گئی۔ اور ان کی انفرادیت برقرار نہ رہ سکی۔ قبائلی قوموں کی وہ عدالتیں جو کبھی ان کے بنائے ہوئے قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرتی تھیں ان قانونوں کو قبیلہ کا ہر فرد بڑی عزّت اور حرمت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اپنا مقام کھونے لگیں وہ قوانین جن کی عدم ادائیگی پر فرد سخت ترین سزا کا مرتکب ہوتا تھا۔ نظر انداز کئے جانے لگے۔ وہ اپنے قوانین کے لئے اس قدر وفادار نہیں رہ گئے جتنے کہ پہلے تھے۔ نہ ان کے دلوں میں آسمانی طاقتوں کا وہ خوف باقی رہا جس کے سبب وہ بہت سے غلط کاموں کو کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ انگریزی اقتدار کی دخل اندازی نے ان کی اس مخصوص نفسیات کو بہت سخت صدمہ پہنچایا اس اقتدار نے قبائلیوں سے ان کی عدالتیں چھین لیں اور انھیں اس بات کا حق نہیں دیا گیا کہ وہ اس معاملے کو روائتی طور پر طے کر سکیں۔ اس طرح قبائلیوں کو سزا و جزا کے معاملے میں انگریزی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانا ضروری ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اب تعزیراتِ ہند کے تحت نافذ کردہ قوانین کی پابندی اُن پر لازمی قرار دی گئی تھی۔ لیکن یہ بھی کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ قبائلی مکمل طور پر اپنے قوانین اور عدالتوں سے محروم ہو گئے تھے۔ وہ قدریں جو سالہا سال سے رائج تھیں یک بارگی ختم نہیں ہو سکتیں۔

آج بھی ان قبیلوں کے افراد قانون شکنی کرتے وقت ایک طرح کا خوف محسوس کرتے ہیں۔ اگر یُوں کہا جائے کہ یہ قومیں آج کل دو طرح کے قوانین کی پابندی کرتی ہیں بیجا نہ ہوگا۔ یعنی اوّل وہ قوانین جو انگریزی عدالتوں کے نافذ کئے ہوئے ہیں اور جن کی حیثیت لازمی ہے اور دوئم وہ جو اُن کے اپنے بنائے ہوئے ہیں اور اُن کی حیثیت اب ضمنی ہے۔ مثال کے طور پر خونریزی اور قتل و غارت کے مقدمات قبائلی عدالتیں اپنے قوانین کے تحت نہیں طے کر سکتیں۔ اس نوعیت کے مقدمات انگریزی قوانین اور عدالتوں کے ذریعہ طے کئے جاتے ہیں۔ لیکن چھوٹے چھوٹے معاملات جیسے چوری، ہلکی پھلکی مار پیٹ یا آپسی جھگڑے ان کے اپنے قوانین کے ذریعے طے ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند قبائلی عدالتوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جس سے ہم کو یہ بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ کہ سزا و جزا کے معاملات میں ان غیر مہذب قوموں کا طریقہ کار کیا رہتا ہے۔

مدھیہ پردیش میں کمار نامی ایک جنگلی قبیلہ بسا ہوا ہے۔ اس قبیلہ میں بھی موروثی اور انگریزی قوانین رائج ہیں۔ پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کمار قبیلہ کے افراد کن باتوں کو جُرم سمجھتے ہیں۔ جہاں تک قتل و غارت کا سوال ہے۔ ہمارے مہذب سماج میں یہ ایک بہت بڑا جُرم ہے۔ اور اس جُرم کی سزا موت یا حبسِ دوام سمجھی جاتی ہے لیکن کمار قبیلے کے لوگوں کی نگاہ میں نہ تو یہ کوئی بہت بڑا جرم ہے اور نہ اس کی سزا موت اگر کوئی کمار قبیلہ کا کوئی فرد قتل کا ارتکاب کرتا ہے تو کمار عدالت کے تحت اپنی برادری کو ایک وقت کا کھانا کھلا کر بری ہو سکتا ہے۔ کمار قبیلہ میں جنگلی پیداوار کی چوری اور دوسرے قبیلہ پر چھاپہ مار کر اس کا اناج وغیرہ لوٹ لانا بھی جُرم کی حیثیت سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ قبیلہ کھلے عام شراب کشی کرتا ہے اور اُسے بغیر لائسنس کے بیچتا ہے۔ جہاں تک چھوٹے چھوٹے آپسی جھگڑوں کا تعلق ہے اس کا فیصلہ دونوں طرف کے اہلِ معاملہ ایک دوسرے کو معینہ تعداد میں گھونسے مار کر طے کرتے ہیں۔

قبائلی ذہن آج بھی آسمانی طاقتوں پر بہت حد تک اعتقاد رکھتا ہے اور اپنے رسم و رواج کے مطابق اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اگر اس سے چند مخصوص قسم کے گناہ سرزد ہوں گے جیسے زناکاری وغیرہ تو اس کی سزا اُسے آسمانی طاقتوں کی طرف سے ملے گی خواہ اس دنیا میں ملے یا مرنے کے بعد، دوسرے کو گالی دینا، بُرا بھلا کہنا۔ دورانِ حمل میں عورت کا باورچی خانے یا مقدّس مقامات میں داخل ہو جانا اس قسم کے جرائم ہیں جن کے بارے میں آسمانی طاقتیں ایسا کرنے والے کو اور یہاں تک کہ اس کے پورے خاندان کو سزا دیتی ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان آسمانی طاقتوں کے جلال نے ان جنگلی قوموں کی نفسیات پر اپنی گہری چھاپ ڈالی ہے۔ جس کے سبب ان سے اس قسم کے جرائم بہت کم سرزد ہوتے ہیں۔ اور بالفرض کوئی ایسا کر گزرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے چین نہیں لینے دیتا اور اس صورت میں یا تو وہ فرد اپنے ذہنی کرب سے نجات حاصل کرنے کے لئے خود کو ہلاک کر لیتا ہے یا اپنے قبیلے کے مذہبی پیشوا کے سامنے اقرارِ جُرم کر لیتا ہے اس طرح یہ کہنا کسی حد تک مناسب ہوگا کہ قبائلی ذہن و ادراک اپنے رسم و رواج میں کچھ اس قدر رچ بس گیا ہے کہ وہ اگر شمہ برابر بھی اس سے ہٹنے لگتا ہے تو سکون نہیں پاتا اور اس کی اپنی نفسیات اس کی سزا کا باعث بن جاتی ہے۔

کمار قبیلہ میں مقدمے پنچائتوں کے ذریعہ طے کئے جاتے ہیں۔ جن میں ایک سرپنچ ہوتا ہے جو عدالت کی کارروائیوں کی صدارت کرتا ہے۔ پنچائت کا ایک چپراسی بھی ہوتا ہے جس کا کام پنچائت کے انعقاد کی تاریخ کی اطلاع دینا ہے۔

پنچائت کے فیصلے عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر رائے عامہ کے تحت ہوتے ہیں جن میں کسی کی آواز کی کوئی مخصوص اہمیت نہیں ہوتی۔ یعنی پنچائت سے تعلق نہ رکھنے والے بھی کسی معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ پنچائت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی کی رائے سے اتفاق کرے۔ بیانات دیتے وقت مدعی اور مدعا علیہ کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے اور آنکھوں دیکھی گواہیاں پیش ہوتی ہیں اس قسم کی گواہیوں پر عموماً اعتماد کیا جاتا ہے۔

زیادہ تر معاملات ایسے ہوتے ہیں جن پر پنچائت مجرم کو حکم دیتی ہے کہ وہ برادری کی دعوت کرے پنچائت دعوت کے لوازمات کی فہرست خود ہی تیار کرتی ہے اس درمیان میں مجرم کو اتنا وقت دیا جاتا ہے کہ وہ دعوت کے انتظامات کر سکے لیکن اس عرصے میں یا تو مجرم گاؤں سے باہر رہتا ہے یا برادری میں اس کا حقّہ پانی بند رہتا ہے۔ آج کل کمار قبیلہ ڈکیتی اور قتل و غارت کے معاملات میں اپنے قوانین سے محروم ہے۔ ان جھگڑوں کا فیصلہ ہندوستانی عدالتوں کے سپرد ہے

لیکن جادو ٹونا کرنا، چھوٹی ذات کی تھالی میں کھانا کھانا، گھوڑے پر سواری کرنا، گائے کو مار ڈالنا، کسی کے زخم پر چوٹ لگانا، چوتھی بیوی کو چھوڑ کر پانچویں شادی کرنا۔ ان تمام معاملات کو کمار قبیلہ کی پنچائتیں طے کرتی ہیں۔ کیوں کہ کمار قبیلہ میں انھیں جرم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہو نامی ایک قبیلہ چھوٹا ناگ پور میں آباد ہے۔ ہو قبیلہ میں انگریزی اثر سے پہلے اس کے اپنے قوانین رائج تھے۔ یہ قوانین بہت سخت تھے۔ ایک زمانے میں زناکاری کے مجرم کو یہاں کے قانون کے مطابق پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب اس جرم کا مرتکب برادری سے نکال دیا جاتا ہے۔ ہو قبیلہ کے وہ افراد جو اپنے رسم و رواج کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ہو زبان میں کاجومیین کہلاتے ہیں وہ اقدامات جن سے فرد کاجومیین کہلایا جاسکتا ہے مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ بدکاری کرتے ہوئے پکڑے جانا۔

۲۔ اپنے ہی قبیلہ کی عورتوں کے ساتھ جنسی تعلقات پیدا کرنا۔

۳۔ چھوٹی ذات والے کے ساتھ کھانا کھانا۔

۴۔ کاجومیین، قرار دی گئی عورت کے ساتھ شادی کرنا۔

ایسے مجرم جو سماج سے نکال دیئے جاتے ہیں اور ان سے سماج آزادی کے سارے حقوق قبیلہ چھین لیتا ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہو قبیلہ میں ممنوع ہے۔ کاجومیین ہو قبیلہ میں گھل مل کر رہ نہیں سکتا۔ قبیلہ کی کسی لڑکی سے اس کی شادی نہیں ہوسکتی۔ وہ اگر مر جائے تو قبیلہ کے لوگ اس کی موت پر آنسو بھی نہیں بہاتے۔ لیکن ہو قبیلہ کی قانون شکنی کرنے والے یہ افراد بڑھتے جا رہے ہیں اور اب تو کاجومیین لوگوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی ہے کہ ان کی ایک الگ برادری قائم ہوگئی ہے۔ جس میں یہ لوگ الگ شادی بیاہ تک کرنے لگے ہیں۔

ہو قبیلہ میں جن معاملات پر سزا دی جاتی ہے اور جن پر پنچائت کے ذریعہ مقدمہ چل سکتا ہے ان میں چند قابلِ ذکر باتیں یہ ہیں:۔

۱۔ خاندان کی خدمت اور اطاعت سے انکار کر دینا۔

۲۔ اپنے متعلقین کو کھانا، کپڑا فراہم کرنے سے انکار کر دینا۔

۳۔ دوسرے کی جائداد کو نقصان پہنچانا۔

۴۔ چوری کرنا۔

۵۔ جادو ٹونے کے ذریعہ دوسرے کو گزند پہنچانا۔

۶۔ گھر آئے مہمان کی خاطر نہ کرنا۔

ہو قبیلہ میں اپنے پاس یا قبیلہ سے ذریعہ معاش کی تلاش میں باہر چلا جانا اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ کنبہ کے وہ افراد جو روزی کی تلاش میں قرب و جوار کے صنعتی شہروں میں چلے آتے ہیں اور کارخانوں وغیرہ میں مزدوری کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ گاؤں انھیں برادری سے نکال دیتا ہے۔ لیکن ان افراد کو قبیلہ ہمیشہ بڑی عزت کے ساتھ یاد کرتا ہے جو ان مقامات سے کبھی واپس نہیں آتے اور وہیں مر کھپ جاتے ہیں۔

ہو قبیلہ میں بُرے کاموں کے بُرے انجام پانے والوں کے بارے میں متعدد قصے اور کہاوتیں بھی مشہور ہیں جن کی تکلیف کے احساس کے تحت یہ عام طور پر غلط باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے اچھے کاموں کا صلہ انھیں قبیلہ کی طرف سے تعریفوں کی صورت میں ملتا ہے اور یہ تعریفیں یقیناً ان کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔

مدھیہ پردیش میں انگما نامی ایک قبیلہ آباد ہے۔ ایک زمانہ میں اس قبیلہ کے سارے انتظامی امور قبیلہ کے ایک سردار کے ہاتھ میں رہا کرتے تھے اور سردار کی طاقت موروثی ہوتی تھی یعنی باپ سے بیٹے کو دی جاتی تھی۔ سردار مطلق العنان ہوتا تھا اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کا مطلب اپنے گھر اور خاندان کی تباہی سمجھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ سرکش اور ظالم سردار قبیلے کے نوجوانوں کے ہاتھوں اپنے عہدوں سے اُتار دیئے گئے ہیں۔ لیکن اب یہ تمام حالات بدل گئے ہیں اور مقامی عہدے داروں نے اپنا اثر کھو دیا ہے۔ اب ان کے سارے معاملات ہندوستانی عدالتوں میں پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک زمین اور جائداد کے جھگڑوں کا تعلق ہے یہ باتیں اب بھی انھیں کے رسم و رواج کے مطابق طے پاتی ہیں۔

آسام کی پہاڑیوں میں ناگاؤں کے بہت ہی سرکش قبیلے آباد ہیں۔ ان کی ایک منفرد حیثیت ہے اور یو پی کے اطراف میں بسے ہوئے قبائل کے مقابلے میں بہت کم مہذب ہیں۔ ناگاؤں کی تاریخ میں خونریزی اور قتل و غارت گری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ آج بھی یہ قبیلہ آدم خور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور موجودہ ہندوستانی حکومت اسے راہِ راست پر لانے کے لئے متعدد جتن کر رہی ہے۔ ناگاؤں کا قبیلہ مختلف کھیل یعنی گروہوں میں بسا ہوتا ہے اور ہر کھیل اپنے انتظامی امور میں خود مختار ہوتا ہے۔ ایک کھیل اور دوسرے کھیل میں کوئی تنازع پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ دونوں کھیلوں کے درمیان انتہائی وحشت ناک خونریزی کی شکل

میں ظاہر ہوتا ہے اسی لیے آج بھی ایک کھیل اور دوسرے کھیل کے درمیان سرحدیں کھینچی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ لیکن انگریزی عمل درآمد کے بعد سے یہ صورت حال قائم نہیں رہی اور قتل و غارت کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس لئے اب ناگاؤں کے آپسی جھگڑے اس صورت سے طے نہیں ہوتے۔

بوتسر بادر کے علاقے میں کھاسا نام کے قبیلے آباد ہیں۔ یہاں پنچائتوں کے ذریعہ کھاسا گاؤں اور اُن کے تیوہاروں کے انتظامات ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کے چال چلن کے معاملات پر پنچائتیں کڑی نکتہ چینی کرتی ہیں۔ اور بھیڑ بکریوں کی چوری پر سخت ترین سزائیں دیتی ہیں۔ چوں کہ اس قبیلے کے لوگ کھیتی باڑی پر گزارہ کرتے ہیں اور جس کے لئے آب پاشی کے ذرائع انتہائی محدود ہیں۔ اس لئے ان معاملات پر جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ جنھیں عدالتیں پوری ذمہ داری کے ساتھ طے کرتی ہیں۔

یو۔پی میں تھارو نام کا ایک اور قبیلہ آباد ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی عورتیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں اور جادو کرنا جانتی ہیں۔ تھاروؤں کے یہاں بھی پنچائتوں کے ذریعہ قانون نافذ کئے جاتے ہیں جن میں سے دو ایک دل چسپ ہیں اور تہذیبی دنیا سے بہت قریب ہیں۔ مثلاً

۱۔ شادی اور دوسری رسوم کے موقعہ پر فضول پیسہ خرچ کرنا منع ہے۔

۲۔ لڑکی کا ازدواجی رشتہ قائم کرنے کے لئے کسی کے ساتھ فرار ہو جانا خلافِ قانون ہے

۳۔ مرد عورت کو کچھ رقم گزارے کے طور پر دے کر طلاق دے سکتا ہے غرضیکہ

اس مختصر جائزے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ غیر مہذب جنگلی قومیں آج کے زمانے میں اپنے اقتدار کا ایک بہت بڑا حصہ کھو چکی ہیں جس کی وجہ سے ان کی زندگی کے مختلف شعبوں کی تنظیم مکمل طور پر انھیں کے ہاتھوں بنائے گئے قوانین کے ذریعہ نہیں ہوتی۔ جہاں ایک طرف ان کے موروثی قوانین ہیں وہاں اُس کے مقابلے میں یہ اپنی ہمسایہ مہذب ریاستوں کی عدالتوں کے بھی دستِ نگر ہیں۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ اُن جنگلی قوموں میں بھی زیادہ تر ایسے قبیلے ہیں جن میں پنچائتیں قوانین بناتی ہیں اور انھیں نافذ کرتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان جنگلی قوموں کا پنچائتی طریقۂ کار ترقی یافتہ سماج کی مداخلت کا نتیجہ ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس مداخلت نے انھیں نقصان بھی پہنچایا ہے۔ اس مداخلت کے زیر اثر قبائلی تہذیب بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ان کے قانونی اور عدالتی ڈھانچے کو تو بدل دیا گیا ہے۔ لیکن اُن کی وہ تہذیبی قدریں اتنی آسانی کے ساتھ نہیں بدلی جا سکتیں جس پر اُن کے خیر و شر اور سزا و جزا کا انحصار ہے۔

---

## گذشتہ دس سال میں تعلیمی ترقی

۳۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو تمام بڑے بڑے صوبوں میں پرائمری اسکولوں کی کل تعداد ۱۲۱۰۴۱ تھی اور ان میں ۴۹۶۰۰۱۱ طلباء زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۵۶ء کی اسی تاریخ کو ان اسکولوں کی تعداد ۲۱۵۳۲۰ تک اور ان کے طلباء کی تعداد ۴۹۸۵۰۷۷ اتک پہنچ گئی۔

لیکن پچھلے برسوں میں سب سے نمایاں ترقی ٹیکنیکل تعلیم اور سائنسی تحقیق کے شعبوں میں ہوئی ۱۹۴۷ء میں بھارت میں انجینیرنگ کا امتحان پاس کرنے والے گریجویٹوں کی تعداد ۹۲۰۰ تھی اور ٹیکنالوجی کے گریجویٹوں کی تعداد ۳۲۰ تھی ۱۹۴۷ء میں سالانہ داخلوں کی تعداد پہلے ڈگری کورسوں کے لئے ۱۲۹۰۰ اور ڈپلوما کورسوں کے لئے ۳۷۰۰ تھی مگر دس سال میں یہ تعداد دُگنی سے بھی زیادہ ہو گئی یعنی ۱۹۵۶ء میں ڈپلوما کورسوں کے لئے سالانہ داخلوں کی تعداد ۴۳۰۰ اور ڈپلوما کورسوں کے لئے ۸۰۰۰ تھی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے تحت مختلف اسکیموں کے مکمل ہو جانے پر ۶۱-۱۹۶۰ء تک ملک کے ٹیکنیکل اداروں میں ڈگری کورسوں کے لئے ۱۰۰۰۰ اور ڈپلوما کورسوں کے لئے ہر سال ۲۱ ہزار طالب علم داخل کئے جا سکیں گے۔

(1667)

میری ولیمس

# برطانوی مُستشرقین اور اُردو

صاحبۂ مضمون مس میری ولیمس لندن یونیورسٹی میں بی، اے آنرز (اُردو) کی متعلمہ ہیں۔ یہ مضمون ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی وساطت سے موصول ہُوا ہے۔ ادارہ مس میری ولیمس کی اُردو دوستی اور اس مضمون کے لیے اُن کا شکر گزار ہے (ع م)

پندرھویں صدی، دُنیا کی تاریخ میں غیر معمولی دلکشی کا سامان رکھتی ہے اس لئے نہیں کہ اس زمانے میں امریکہ دریافت ہوا، وہ تو بقول فان بارٹ دریافت ہوتا ہی۔ چاہے کولمبس وہاں پہنچتا یا نہیں۔ موافق یا مخالف ہواؤں نے ان لوگوں کو اُس براعظم کے ساحل پر لا ڈالا تھا۔ اس واقعہ کی اہمیت ان کے شعور کا جزو نہیں بن سکی تھی۔ اسی لئے دریافتیں اتنی اہم نہیں جتنا دریافت کرنے کا رجحان اہم ہے۔ اس صدی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سفر جو نمونۂ سقر تھا، وہ "وسیلۂ ظفر" بن گیا اور لوگ سیر و سیاحت میں سب سے زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ طالب علم، فن کار، سپاہی، تاجر، عالم، اور مبلّغ اس طرح گھروں سے نکل پڑے جیسے یہاں بہار کے موسم میں لوگ [illegible]احل کے کنارے سیر و تفریح کے لئے جمع ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات تِل رکھنے [illegible] جگہ نہیں ملتی۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی اہلِ یورپ کا "راس [illegible] امید" کے ذریعہ ہندوستان پہنچنا ہے۔ اس دریافت نے، نہ صرف یہ کہ مادّی و[illegible]ل بڑھا دیئے بلکہ مغرب کے سامنے مشرق کے علوم و فنون اور ان کے تہذیب و تمد[illegible] کے خزانے بھی کھول دیئے۔ خاص طور پر انگریزوں نے ہندوستانی ذہن اور د[illegible] تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ملکی زبانوں کو سیکھنا شروع کیا اور اٹھارویں ص[illegible]ی میں ہندوستانی لسانیات کی بنیاد ڈالی لیکن یہ راستہ بڑا دشوار گزار تھا۔

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اور اس [illegible] زبانوں اور بولیوں کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ ہے لیکن مدبّر، مبلّغ اور عالم اپ[illegible] اپنے دائرہ میں زبانوں کی مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سر ولیم جونس نے ہندوستانی لسانیات کے سلسلہ میں سنسکرت کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ کیا اور ساری عمر انڈو یورپی زبانوں اور سنسکرت کے باہمی تعلّق کو سمجھنے میں صرف کر دی اس کے ساتھی اور جانشین سر چارلس ولکنس اور ہنری کول بروک نے اس کام کو جاری رکھا اور اس طرح تقابلی لسانیات کی جڑیں مضبوط کر دیں۔ جونس نے ترجمے بھی کئے ہیں۔ جو آج تک دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ۱۷۸۴ء میں اُس نے بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی قایم کی۔ ولکنس جو فارسی اور بنگالی جانتا تھا۔ اس سوسائٹی کا حیاتی ممبر تھا۔ اس نے ہندوستانی چھاپے کو ڈھالا اور پریس کی ترقی میں مدد دی۔ اس کے علاوہ ۱۸۲۳ء میں اس نے برطانیہ میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام کی بڑی کوشش کی اس کا پہلا صدر ہنری کول بروک تھا۔ جس نے سنسکرت کے بیش قیمت مخطوطات جمع کئے اور ہندوستانی لسانیات کے کام کو فروغ بخشا۔

۱۸۰۰ء میں برطانوی مُستشرقین، لسانیات سے آگے بڑھ کر زبان و ادب کے میدان میں بھی قدم رکھنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جو فورٹ ولیم کالج کا پہلا پرنسپل تھا۔ اس وقت مغلیہ خاندان کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور سیاسی کمزوری کے ساتھ فارسی بھی زوال پذیر تھی۔ اس خلا کو ایک حد تک اردو نے پُورا کر دیا جس میں سلطان قلی قطب شاہ اور ملا وجہی بلکہ ان سے بہت پہلے سے قابلِ قدر سرمایہ جمع ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے اچھے اُستاد رکھے۔ کتابیں لکھوائیں، ترجمے کرائے اور خود انگرکھا اور سلیم شاہی جوتیاں پہن کر زبان کو سیکھنے کے لئے گلی گلی پھرا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں لیکن اُردو لغت، قواعد اور لسانیات پر اس کا کام یادگار رہے گا۔

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کا ایک ہم عصر ڈنکن فاربس ہے جس نے برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست ۱۸۴۹ء سے لے کر ۱۸۵۵ء تک شائع کی ہے اس کے علاوہ اس نے عربی، فارسی اُردو اور بنگالی کی قواعد و لغات پر بھی کام کیا ہے اس نے ۱۸۲۲ء سے ۱۸۲۶ء تک کلکتہ اکاڈمی میں پڑھایا اور اس کے بعد لندن میں اُردو کا استاد مقرر ہو گیا۔

فاربس کی طرح بہت سے برطانوی مستشرقین نے تعلیمی کام انجام دیا ہے۔

جان پلیٹس جو اپنی اُردو انگریزی لغت کے لئے مشہور ہے وہ ۱۸۵۷ء کے دوران میں صوبہ متوسط میں انسپکٹر آف اسکول تھا اور بعد میں بنارس کالج کا ہیڈ ماسٹر ہو گیا۔ انگلستان جا کر بھی اس نے اپنی دلچسپیاں قائم رکھیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ۱۸۸۰ء میں آکسفورڈ یونی ورسٹی میں فارسی کا اُستاد مقرر کر دیا گیا جہاں وہ مدت تک انڈین سول سروس کے امیدواروں کا اُردو میں ممتحن رہا۔

طامس آرنلڈ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، گورنمنٹ کالج لاہور اور یونی کالج لندن میں پروفیسر رہا اس نے انڈیا آفس کے اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے۔ اس کی سب سے مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام ہے جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی۔ دوسری المعتزلہ جو ۱۹۰۲ء میں چھپی۔

ڈاکٹر اشپرنگر جرمنی کے شہر ٹاٹرل میں پیدا ہوا تھا لیکن وہ انگلستان میں بس گیا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی میڈیکل سروس میں شامل ہو کر ہندوستان پہنچا۔ یہاں وہ قدیم دلّی کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا جو اس زمانہ کے بہت مشہور اداروں میں سے تھا۔ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۰ء تک وہ لکھنؤ میں نائب ریذیڈنٹ بھی رہا۔ اس کے علاوہ اس نے کلکتہ مدرسہ اور محمڈن کالج ہگلی کے پرنسپل اور ایشیاٹک سوسائٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ "فہرست کتب خانہ ہائے شاہانِ اودھ" ہے۔ اس کا اُردو اور فارسی کا ذخیرہ جرمنی میں محفوظ ہے

اشپرنگر نے دہلی سے ایک اُردو کا ہفتہ وار اخبار بھی نکالا تھا جس کا ذکر

Buckland's Biographical Dictionary

میں موجود ہے۔

یہ تمام کام جو اشپرنگر کے زمانے تک ہوا اس نے گریرسن کے لسانیاتی جائزے کے لئے زمین ہموار کر دی۔ اس کام میں وہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۲ء تک مصروف رہا۔ اس میں ہندوستان کی ۸۷۰ زبانوں اور بولیوں کا ذکر ہے اور ۳۶۸ زبانوں کے الفاظ کا باہمی تقابل کیا گیا ہے۔ یہ جائزہ نو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے، اور محنت اور جانکاہی کی عجیب و غریب مثال ہے۔

علمی کام کرنے میں حوالہ کی کتابوں کی بڑی اہمیت ہے۔ برٹش میوزیم دنیا کے بہت بڑے کتب خانوں میں سے ہے اس کی الماریوں کو اگر ایک قطار میں کھڑا کیا جائے تو اسی میل کی قطار ہو گی۔ اس میں اُردو کا بھی بے مثل ذخیرہ ہے جس کی فہرست بلوم ہارٹ نے بڑی محنت سے مرتّب کی ہے۔ ۱۸۶۷ء کے قانون کے مطابق ہر کتاب کا یہاں ہونا ضروری ہے۔ قلمی کتابوں کا بھی نادر اور بیش قیمت ذخیرہ ہے جس میں سے سر ہنری ایلٹ اور کرنل ولیم ہملٹن کی عطا کردہ ہیں اس کے علاوہ آکسفورڈ کی Bodleian اور انڈین انسٹی ٹیوٹ لائبریری کیمرج کی یونی ورسٹی لائبریری اڈنبرا کے قومی کتب خانے، لندن کے اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز اور انڈیا آفس میں بھی اُردو کی اچھی اور پرانی کتابیں موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو بے مایہ زبان نہیں ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اُردو سے ہمارا یہ تعلق صرف داستانِ پارینہ نہیں۔ اس وقت بھی جب کہ برطانیہ کے ہندوستان اور پاکستان سے نئے اور پہلے سے زیادہ مضبوط رشتے قائم ہو چکے ہیں، یہ تعلق موجود ہے بلکہ روز بروز بڑھ رہا ہے ۱۹۴۴ء میں جو اسکاربروگ کمیشن مشرقی علوم کی ترقی و ترویج کے متعلق بیٹھا تھا اس نے یہ پُر زور سفارش کی تھی کہ ہمیں جدید ہندوستانی زبانوں کے ترجمے انگریزی میں کرانا چاہئیں اور ان شعبوں پر علمی کام کو ترقی دینا چاہیئے۔ خواہ لڑکوں کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ اس وقت لندن اور اڈنبرا میں اُردو کے شعبے موجود ہیں اور وہ اپنی بساط کے مطابق کام کر رہے ہیں۔

مضامین اُسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جبکہ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ان کے ہمراہ ہوں گے۔

جوگندر پال

# ہوش بے ہوشی

راؤ اینڈ راؤ لمیٹڈ کے سول پروپرائٹر راؤ نے جب وِسکی کا چھٹا ڈبل پیگ گلے میں پھینکا تو سامنے دیوار پر چار ہاتھوں والے مسکراتے ہوئے وِشنو بھگوان کی تصویر کو دیکھ کر وہ ذرا رُک گیا۔

" وشنو بھگوان "۔ راؤ نے ایک اور پیگ گلاس میں انڈیلا اور کسی بھگت کی طرح وشنو کی تصویر کی طرف ٹکٹکی باندھ لی۔

" میرے بھگوان "، دفعتاً وہ گڑگڑانے لگا۔ " میں بہت گنہ گار ہوں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے کبھی کوئی نیک کام نہیں کیا۔ بھگوان! تم گرتوں کو سنبھال لیا کرتے ہو، مجھے بھی سنبھال لو دیالو۔" وِسکی کے گلاس کو ہاتھ میں لئے لڑکھڑاتا ہوا وہ تصویر کے قریب آن کھڑا ہوا اور بدستور منت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ " میں گلے تک پاپ کی دلدل میں دھنس چکا ہوں بھگوان، میں مر جاؤں گا، مجھے بچا لو۔"

وشنو شانتی کی تصویر بنے اور دائیں طرف کے تیسرے ہاتھ کی کھلی ہوئی ہتھیلی کو آشیرواد دینے کے انداز سے راؤ کی جانب اٹھائے مسکراتے رہے۔ " بیٹا، تیرا کلیان ہوگا۔" گویا تصویر چپکے چپکے اُس کے کانوں میں گنگنانے لگی ہو۔ راؤ نے شردھا سے جھومتے ہوئے وِسکی کا ساتواں پیگ بھی منہ سے لگا لیا اور نہایت ادب سے اپنے سر کو جھکا کر اسے یوں پینے لگا جیسے اُس کا ہوم باپ بھگوان کے چرنوں میں بیٹھ کر امرت پیا کرتا تھا۔

" ان چرنوں میں بیٹھ کر زہر بھی پی لو تو وہ امرت بن جاتا ہے بیٹا۔" اُس کا باپ اُس سے کہا کرتا تھا۔

" امرت۔" راؤ لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پھر صوفے پر آ بیٹھا۔

" مالک " اُس کا بوڑھا ملازم جھجکتے ہوئے اسے اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔

" تم، وادھو چچا؟ سنو، سوائے بھگوان کے کوئی کسی کا مالک نہیں۔ ارے اُدھر کیوں کھڑے ہو؟ اِدھر میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ نا۔ تم گھر کے نوکر نہیں، گھر والے ہو، آؤ، تم بھی امرت پیو، امرت پینے کا حق ہر انسان کو یکساں طور پر حاصل ہے۔ بھگوان کا امرت سب کے لئے ہے۔ اُس کی دُھوپ، بارش اور ہوا کی طرح۔ آؤ وادھو چچا، میرے پاس بیٹھ کر تم بھی جی بھر کر امرت کا مزہ چکھو۔ تم بہت نیک آدمی ہو، تم مہان ہو وادھو چچا۔ تم اپنے آپ کو فالتو نہ سمجھا کرو۔ تم ہی بتاؤ۔ اگر تم نہ ہو تو گھر کا یہ سارا سلسلہ کون سنبھالے۔ گھر سنبھالنے والی دس سال ہوئے چل بسی۔ وادھو چچا تم تو گھر کے پُرانے آدمی ہو، اب تم سے کیا پردہ؟ میں اُس لکشمی کو کتنا تنگ کیا کرتا تھا۔ اُس پر لاکھ ستم توڑے پر وہ دھرم کی پُتلی اپنی جلتی ہوئی چتا پر لیٹی ہوئی بھی مسکراتی رہی۔ کھڑے کیوں ہو؟ قریب آ کر بیٹھ جاؤ نا۔" راؤ خالی گلاس میں وِسکی انڈیلنے کے لئے ٹھہر گیا۔

" مالک، اب اور نہ پیجئے۔" وادھو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

" زیادہ پینے سے انسان عظیم ہو جاتا ہے وادھو چچا، والمیک نے اپنی ساری رامائن رام رنگی کے اٹوٹ نشہ سے سرشار ہو کر لکھی تھی، آؤ، تم بھی پی لو۔ شراب پی کر اگر تم پیمانہ سے باتیں نہ کرنے لگو تو میرے منہ پر تھوک دینا۔

" وادھو چچا، اگر تم چاہو تو پئے بغیر بھی میرے گھناؤنے منہ پر تھوک سکتے ہو۔ میں بہت بُرا آدمی ہوں۔ کوئی بُرا کام نہیں جو میں نے نہ کیا ہو۔ میں شیطان ہوں اور شیطان کسی حالت میں بھی نیکی کا گلا گھونٹنے سے نہیں چوکتا۔ میرے ہاتھ " راؤ اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے ذرا رُک گیا " میرے ہاتھ نیکی کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔" اُس کی آواز میں آنسو بھر آئے۔ " میری بیوی، میری شیطانیت پر گڑنے

کی بجائے خود سے نہایت اچھی طرح سے پیش آیا کرتی تھی مگر میں اُس کے اِس رویّہ سے مزید سہنشا جاتا۔ میری بیلا واقعی دھرم مورتی تھی۔ مگر وادھو، جب اس دھرم مورتی نے آخری سانس لیا تو سچ کہوں مجھے اندرونی طور پر اطمینان سا ہو گیا جیسے میرے ضمیر کی موت واقع ہو گئی ہو۔

"دراصل میں اپنی بیوی کے گھریلو اطوار سے بہت اُکتا چکا تھا۔ مجھے شوخ لڑکیاں نہایت پسند تھیں مگر ایسی چنچل لڑکیاں بھی جب رضامندانہ یا غیر رضامندانہ طور پر اپنی تمام دل کش شوخیاں میرے حوالے کر دیتیں تو اُن کی اداسیوں سے بھی اجنبیت اختیار کر کے میں اپنی دل بستگی کے لئے نئی راہیں ڈھونڈنے لگتا۔ میرا گھر میری قانونی بیوی کا ہی نہیں، بلکہ کئی خوش رُو مجبور لڑکیوں کی تازہ جوانیوں کا مقبرہ ہے۔" دیو داس کی طرح بھی بہکی گھنی اداسیاں راؤ کے ماتھے پر رینگنے لگیں۔

"مالک، میں آپ سے کہنے آیا تھا کہ چنڈی داس جی آپ سے ملنے آئے ہیں۔" وادھو نے آخر موقع پا کر کہا۔

"اُسے یہیں بھیج دو وادھو چچا۔"

چنڈی داس راؤ اینڈ راؤ لمٹیڈ کا خزانچی تھا۔ راؤ نے اُسے دو چار روز سے کام سے معطل کر رکھا تھا۔ کیوں کہ اُس کے لیجر میں ڈیڑھ ہزار روپیہ کا حساب نہیں ملتا تھا۔ کل عدالت میں مقدمہ کی سماعت تھی۔

دِسکی کے نشے میں منتشر خیالات راؤ کے ذہن میں تیزی سے اُڑ رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا۔ "کبھی زمانہ تھا کہ چنڈی داس کا باپ اور میرے پتا جی کاروبار میں برابر کے حصّہ دار تھے۔ پتا جی کی موت کے بعد میں نے چنڈی داس کے بھولے بھالے باپ کو کوڑی کوڑی کا محتاج بنا دیا۔ آج اُس کا بیٹا جسے عام حالت میں میرا برابر کا حصّہ دار ہونا چاہئے تھا میرا ایک معمولی ملازم ہے اور وہ بھی معطل حالت میں۔"

"چنڈی داس"، جب چنڈی داس کمرے میں داخل ہوا تو راؤ نے سگریٹ سُلگا کر بوتل سے رہی سہی شراب بھی گلاس میں انڈیل لی۔ "چنڈی داس، میں شراب پی رہا ہوں۔ شراب پینا بہت بُرا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں امرت نہیں پی رہا اور سچ پوچھو تو میں امرت پینے کے قابل نہیں۔ اچھا، چھوڑو ان باتوں کو۔ تم اس لئے آئے ہو کہ تمھارا کیس میں پولیس سے واپس لے لوں۔ ارے بیٹھ جاؤ بھائی۔ کھڑے کیوں ہو؟ تم مجھ سے معافی مانگنے آئے ہو؟ نہ ——— نہ ——— اُس بھگوان سے معافی مانگو میں بھلا کون ہوں جو تمھیں معاف کر سکوں؟ میں تو خود گنہ گار ہوں چنڈی داس۔

"چنڈی داس، ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ دُنیا میں کوئی کسی کا بھائی نہیں چنڈی داس، تم اس طرح مجرموں کی مانند سر جھکا کر کیوں بیٹھے ہو؟ تم نے کوئی چوری نہیں کی، یہ سب تمھارا مال ہی تو ہے۔ تم نے اپنے مال ہی سے ڈیڑھ ہزار روپے لئے ہیں۔ تم میرے بھائی ہو چنڈی داس۔ تمھارا باپ، میرے باپ کا حصّہ دار تھا، تم میرے حصّہ دار ہو۔ دُنیا میں ——— دُنیا میں کوئی کسی کا حصّہ دار نہیں۔ بھگوان ——— بھگ ——— وان (ہچکی لیتے ہوئے) سب کا مالک ہے۔

"تم مسکرا رہے ہو چنڈی داس۔ ٹھیک ہے۔ لیکن تم نے چوری کی ہی کیوں؟ چوری کرنا بہت بڑا پاپ ہے، چنڈی داس، میں بھی تمھاری طرح ایک چور ہوں۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں، جاؤ، خوش رہو، کل صبح میں تمھارا کیس واپس لے لوں گا۔ تمھاری عزت ع ——— زت میری عزت ہے۔ نہیں، میرا شکریہ ادا نہ کرو۔ میری عزت نہ کرو۔ میں چور ہوں لفنگا ہوں۔ ش ——— راب پیتا ہوں (ہچکی لیتے ہوئے) چرن امرت پیتا ہوں۔ جاؤ، جاؤ" ——— راؤ پر بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ "چنڈی داس میرا بھائی ہے۔ میں شرابی ہوں ——— چنڈی داس تو تم بھی پیو۔ دیوتا بھی سوم رس پیا کرتے تھے۔ جاؤ مرچ ——— ا ——— ڈ ——— ے" بے ہوشی میں راؤ کا سر کرسی کے پُشت پر جا گرا۔

پُر اُمید طور پر ہتھیلیاں ملتا ہوا چنڈی داس آہستگی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن صبح کو جب راؤ کی آنکھ کھلی تو خاصہ دن چڑھ آیا تھا۔

"وادھو! راؤ اُٹھتے ہی تحکمانہ لہجہ میں چلّایا۔ کم بخت ہمیں جلدی کیوں نہیں جگایا۔ تمھیں معلوم تھا کہ آج چنڈی داس کا کیس ہے۔"

"حضور، میں نے سوچا تھا کہ آپ ذرا آرام کر لیں۔ رات بہت تھکے ہوئے تھے۔"

"جاؤ، زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ جلدی ناشتہ تیار کرو۔"

"وہ تو تیار ہے مالک۔" بوڑھا وادھو باہر جاتا ہوا ذرا رک گیا اور راؤ کی طرف اس طرح دیکھنے لگا گویا کچھ کہنا چاہتا ہو۔

"کیا ہے؟"

"سرکار، رات چنڈی داس جی آئے ہوئے تھے۔ آپ سے باتیں بھی ہوئی تھیں۔ وہ کہتے تھے آپ نے انھیں معاف کر دیا ہے۔"

"دیکھو وادھو، تمھیں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں شراب پئے ہوئے ہوں تو کسی کو ملاقات کے لئے اندر نہ لایا کرو۔ نہ جانے پی کر کیا بہکنے لگتا ہوں۔"

"جو حکم مالک" وادھو باہر جانے لگا مگر راؤ کی آواز سُن کر پھر ٹھہر گیا۔

"اور دیکھو، اگر اپنے مینجر کی طرف سے آئے تو اُسے کہنا میرا انتظار کرے۔ میں اُس چور کا بندوبست کر کے کچہری سے سیدھا یہیں چلا آؤں گا۔"

"جی حضور۔" وادھو سوچ رہا تھا۔ "ہمارا مالک بھی بڑا عجیب آدمی ہے۔ شراب پی کر سادھو مہاتما بن جاتا ہے اور جب ہوش میں آتا ہے تو مرائیوں کی طرح بہکنے لگتا ہے۔"

انور احمد سوپاروی

# سوپارہ
## تاریخ کا ایک گمنام شہر

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے کے کئی مشہور اور پُر رونق شہر آج اپنی عظمتِ رفتہ کھو چکے ہیں اور بعض مقامات تو ہمارے علم سے ہی دُور ہو چکے ہیں۔ دُنیا نے انھیں مطلق فراموش کر دیا ہے۔ جس شہر کو کل عروج حاصل تھا آج اُس کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ بڑی بڑی عظیم الشان حکومتیں صفحۂ دہر پر اُبھریں اور مٹ گئیں۔ ان کی شان و شوکت، جاہ و جلال اور سطوت کا دُھندلا سا عکس تاریخ کے اوراق تک ہی محدود رہ گیا۔ ہندوستان کا ماضی بلا شُبہ نہایت شان دار اور درخشاں تھا۔ کسی زمانے میں ہندوستان تجارت، علم فن، تہذیب و تمدّن میں مرکزِ عالم تصوّر کیا جاتا تھا۔ علمی فضیلت کا یہ عالم تھا کہ اقوام دہر نے اس چمن سے خوشہ چینی کرنے میں فخر محسوس کیا۔ لیکن انتہائی اوج پستی کا پہلا زینہ ہے اور اس قانونِ قدرت سے کسے مفر ہے! روم، مصر اور چین کی عظیم الشان اور پُرشکوہ حکومتیں بھی نذرِ زمانہ ہو گئیں۔ ان کے قدیم خوشنما اور آباد شہروں کے کھنڈرات زبانِ خاموش سے زمانہ کی چیرہ دستیوں اور ریشہ دوانیوں کا شکوہ کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے فلک بوس محلات ہم دوشِ زمین ہو کر تودۂ عبرت بنے ہوئے ہیں۔

خود ہندوستان میں کئی شہر تاریخ کے اوراق میں گم ہو چکے ہیں جن میں سوپارہ یا شُرپارک (قدیم تاریخی نام) بھی ایک ہے۔ سوپارہ قدیم زمانے میں ساحلی ہندوستان (مغربی) کا ایک نہایت ہی مشہور اور خوبصورت شہر تھا جس کی بندرگاہ میں غیر ملکی جہاز آکر رُکتے تھے۔ ہندوستان کے تجارتی مال کا بیشتر حصّہ اسی بندرگاہ سے غیر ممالک میں جاتا تھا۔ ممکن ہے قارئین اس پر انگشت بدنداں رہ جائیں۔ اس حیرانی کو مٹانے کے لئے ہمیں تاریخ کا سہارا لینا پڑے گا۔

لیکن تاریخ بھی اس سلسلے میں ہماری اعانت نہیں کرتی۔ ہندوستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ تاریخی سرمایہ کے اعتبار سے وہ قلاش ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے کی تاریخ لکھنے میں بڑی دقّت پیش آتی ہے۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں نے شائد اس طرف بہت کم توجہ دی۔ اور اگر کسی دَور میں چند تاریخی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں تو وہ تغیّراتِ زمانہ کا شکار ہو گئیں۔ بہر حال اس زمانہ کی مذہبی کُتب مثلاً وید، اُپنشد، براہمن گرنتھ، راماٹن، مہابھارت، سمرتیاں، پُوران، درشن اور سوتر وغیرہ کے ذریعہ ہم اس زمانہ کے طرزِ معاشرت مذہبی زندگی، تجارتی حالات اور ان کی حکومتوں کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ قدیم کھنڈرات بھی کافی مدد دیتے ہیں۔ ہاں اس زمانے میں جو غیر ملکی سیّاح ہندوستان میں آئے، ان کے سفرناموں سے بھی ہم بہت کچھ اخذ کر سکتے ہیں اور پھر کتبے، سکّے اور سنگ تراشی کے نمونے تو ایک روشنی کے مینار کا کام دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی ایک شہر کی تاریخ یا اس کی عظمتِ رفتہ کو روشنی میں لانا نہایت ہی دشواری کا کام ہے۔

آج کل سوپارہ، ضلع تھانہ (علاقہ کوکن) کا ایک گاؤں ہے جو شہر بمبئی سے صرف ۳۰ میل دُور ویسٹرن ریلوے کے مغرب میں ایک میل کی مسافت پر واقع ہے۔ مہابھارت میں ہمیں کوکن کی جگہ اپرانت کا ذکر مندرجہ ذیل عبارت میں ملتا ہے جس میں شُرپارک (سوپارہ) کا خاص ذکر ہے۔

तत शूपरिक देश, सागर स्तस्य निनरे

सहसा जामदग्न्यस्य सोह परान्त महीतलम ॥

(ترجمہ۔ شہر شُرپارک سمندر سے نرمان ہوا ہے۔ جسے رشی جامدگنی نے باساتی سمندر

سے برآمد کیا۔)

مہابھارت کا اپرانت (کوکن) موجودہ شمالی کوکن، بناوسی اور گومنتک پر مشتمل تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ آرین قوم نے ۱۷۰۰ء ق م سے ۶۰۰ ق م میں اپرانتا کے علاقہ میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں اُنھوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی بنائی تھیں حضرت مسیح کی پیدائش کے زمانہ تک کوکن کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ مورخین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں اپرانتا کو ایک نیا نام ملا۔ جسے آج ہم کوکن کہتے ہیں۔ جیسا کہ اکثر عرب سیاحوں نے کمکم، الکمکمی، کنکن لکھا ہے علامہ ابن خردازبہ (متوفی ۲۵۶ھ) نے اس کا کمکم، اور کنکن کے نام سے ذکر کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب "المسالک و الممالک" میں لکھا ہے۔

واعظم ملوک الھند بلھرا و تفسیرہ ملک الملوک
و نقش خاتمہ من ودّک لا یر ولی مع انقطاع عنہ
و نیزل الکمکم بلاد الساج۔ (المسالک والممالک صـ۶۷)

ترجمہ:۔ "راجہ بلہرا (ولبھ دائے والئے گجرات) ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ ہے جس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ اس کی انگوٹھی پر یہ عبارت نقش ہے کہ جو کوئی تم سے کسی ضرورت کے لئے محبت کرے تو اس کے ختم ہوتے ہی وہ بھاگ جائے گا۔ یہ راجہ ساگوان دیس کمکم میں آتا رہتا ہے۔"

مشہور اسلامی مورخ اور سیاح ابو حسین علی بن حسین (متوفی ۳۴۶ ھ) اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھتا ہے۔

"و تدعی بلادہ ایضاً الکمکن۔" یعنی اور بلہرا کا ملک کمکم ہے۔
(مروج الذہب صفہ ۱۱۰)۔

جغرافیہ نویس ابن رشد نے کتاب "الاعلاق النفیسہ" میں کمکم لکھا ہے۔

مہابھارت میں شرپارک (سوپارہ) ایک تیرتھ گاہ اور بندرگاہ کی حیثیت سے مشہور تھا شور ( ) کے معنی بہادر کے ہیں اور اس نسبت سے اس شہر کا نام "بہادروں کی بستی" یا شرک پارک رکھا گیا ہوگا۔ یہاں کے لوگوں کو بہادر اس لئے بھی کہا جاتا ہوگا کہ اس وقت سوپارہ کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ کیوں کہ اس کے مغرب میں بحیرہ عرب تھا اور سوپارہ کی بندرگاہ کا رُخ مشرق کی طرف تھا۔ جہاں ویترنا ندی (ہندوؤں کی مقدس ندی) اور الہاس ندی کا [illegible] آکر اس طرح مل جاتا تھا کہ سوپارہ ایک جزیرہ کی صورت میں رہ جا[illegible]

تھا۔ اس زمانہ میں سمندر کے قریب رہنے والوں کو اور سمندری سفر کرنے والوں کو عام طور پر بہادر اور نڈر سمجھا جاتا تھا، یا پھر شورپا کے معنی سنسکرت میں سوپ (چاول پھٹکنے کی مربع نما ٹوکری) کے ہوتے ہیں اور چوں کہ سوپارہ (جزیرہ) کی شکل بھی اسی قسم کی ہو جاتی تھی اس لئے "شرپارکا" کے نام سے مشہور ہو گیا ہو۔

بُدھ مت کے ظہور اور اشاعت سے پہلے سوپارہ ہندو مت کا مرکز تھا۔ یہاں ایک "رام کنڈ" بھی ہے جو اس کے تیرتھ گاہ ہونے کا ثبوت ہے۔ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ سوپارہ بڑے بڑے راجاؤں کی راجدھانی تھا۔ بدھ مت کی کتابوں میں بھی سوپارہ کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ سوپارہ کے علاوہ مغربی ساحلِ ہند پر کلیان، چول، تھانہ، چیمور، اور سنجان بڑی بڑی بندرگاہیں تھیں لیکن سوپارہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔

اُنیسویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں سابق حکومتِ بمبئی نے سوپارہ پر توجہ دی اور مشہور ماہر کتابہ اور آثار قدیمہ

Epigraphist & Archaeologist

پنڈت بھگوان لال اندراجی نے ۱۸۸۲ء میں اشوک کے تعمیر کردہ "استوپ" کی کھدائی کی اور یہاں سے ایک منگی کتبہ دریافت کیا جو شہنشاہ اشوک کا ایک یادگاری پتھر ہے۔ اس پر دس سطریں تھیں۔ پہلی چار سطریں مٹ چکی ہیں۔ باقی عبارت دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے۔ دوسری بار مسٹر ایچ، کیو امنیر نے سونلا نہاٹ میں ۱۹۳۱ء میں کھدائی کی۔ جہاں انھیں ایک قدیم مندر کی بنیاد کا پتہ چلا۔

حکومت بمبئی نے جو تاریخی کتبے جمع کئے ہیں ان میں ایک کتبہ کنہری غار سے برآمد ہوا ہے۔ جس پر سوپارہ کے ایک سوداگر سیمیکا کے ایک تحفہ کا ذکر کندہ ہے۔ ایسی ہی ایک اور عبارت [illegible] کی ایک غار کے ایک کتبہ پر ملی ہے۔ یہ غار ۲۰۰ء ق۔م میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں سوپارہ کو "شوپارگا" لکھا ہے۔

یہ تاریخی شواہد اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ سوپارہ کسی زمانے میں مغربی ہندوستان کا ایک خوشنما اور بڑا شہر تھا جو نہ صرف ملک میں بلکہ غیر ممالک میں بھی اپنی شہرت رکھتا تھا۔ اس کی بندرگاہ سے ہندوستانی سوداگر اپنا تجارتی مال لے کر عرب، مصر، چین اور [illegible] تجارتی منڈیوں میں جاتے تھے۔ عرب کے اکثر میلوں میں ہندوستانی سوداگر شامل ہوا کرتے تھے۔ عرب میں سال میں ۱۳ مقامات پر میلے لگتے تھے وہ مقامات یہ ہیں:۔

دومتہ الجندل، مشقر، صحار، ذوالمجاز، شحر، دما، منی

مسلمانوں میں یہ رسم انیسویں صدی کے آخر تک جاری تھی [1]۔

نصف صدی پہلے شادی بیاہ کی رسموں کی یک رنگی کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ جن لوگوں کے اولاد نہیں ہوتی یا جنھیں اور علتوں کی طرح شادی بیاہ کا چسکا بھی لت کی طرح تھا وہ گڈے گڑیا کا بیاہ رچاتے تھے، دھوم دھام سے برات چڑھتی تھی اور باقاعدہ قاضی یا پنڈت کو بلوا کر نکاح پڑھوایا جاتا تھا۔ دہلی آگرہ اور امرت سر میں ہونے والی ایسی رسموں کا تذکرہ پرانے اخباروں میں بھی مل جاتا ہے [2]۔

ہندوؤں میں رواج ہے کہ ایک ورن کی شادی دوسرے ورن میں نہیں ہوتی مثلاً کھتری کا ناتہ کھتری کے ہاں اور ویش کا ناتہ ویش کے ہاں ٹھہرایا جاتا ہے اور اونچی ذات والے ادنیٰ ذات والوں سے میل جول جائز نہیں سمجھتے۔ اگرچہ یہ اسلام کے عدل اور تعلیمِ مساوات کے خلاف ہے لیکن کچھ سال پہلے تک مسلمانوں میں بھی یہ رواج تھا کہ "سیدوں کی سیدوں میں، یا شیخوں میں، مغلوں کی مغلوں میں یا پٹھانوں میں شادی کی جاتی تھی" [3]

دونوں مذہب والوں میں شادی سے پہلے منگنی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں منگنی کے موقع پر دلھن کو چڑھاوے کی رقمیں چڑھانے کے بعد ایک رسم "روپ درشن" ادا کرتے ہیں۔ یہ الفاظ گواہی دے رہے ہیں کہ یہ رسم بھی اہلِ ہند سے لی گئی ہے۔ "منگنی کے بعد دونوں میں" ہر تیج تہوار کو لینے دینے کی رسمیں شروع ہو جاتی ہیں۔" اس سلسلے میں مسلمانوں میں شب برات اور عید کی طرح دوالی اور ساون بھی تہوار سمجھے جاتے ہیں اور ان پر لین دین ہوتا ہے [4]

شادی سے کچھ روز پہلے مسلمانوں میں، مانیوں بٹھانا ایک رسم ہے اس میں دلھن کو مانجھے پر ضرور بٹھانا پڑتا ہے۔ "مانجھا پنجابی زبان میں پلنگ یا چارپائی کو کہتے ہیں" ظاہر ہے یہ رسم مسلمانوں میں اہلِ پنجاب سے آئی ہے۔ مسلمانوں میں دولھا دلہن کو مانیوں بٹھانے کے بعد اندر عورتیں اور باہر مرد اُبٹنا کھیلتے ہیں۔ یہ رسم بہت کچھ ہندوؤں کی ہولی اور رنگ پاشی سے ملتی جلتی ہے۔ شادی سے کچھ روز پہلے ہندوؤں مسلمانوں دونوں کے ہاں دولھا دلھن کے گھروں میں ہم عمر لڑکیاں اور جوان عورتیں آپس میں مل کر سہاگ اور گوڑیاں گاتی ہیں۔ ان کے الفاظ اور بول بھی ایک ہی ہیں۔ دونوں مذہب والوں میں زخم چشم سے محفوظ رہنے کے لئے دولھا کے ہاں کوئی ہتھیار یا چاقو دے دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں شادی سے پہلے دلھن سے صحنک یعنی حضرت فاطمہ کی نیاز بھی دلوائی جاتی ہے۔ اس رسم کی ایجاد شاہجہان کی ماں جودھا بائی سے منسوب ہے۔

اُوپر کے بیانات سے ظاہر ہے کہ ہندو مسلمانوں کی رسمیں ایک دوسرے سے گہری مناسبت رکھتی ہیں چنانچہ اُردو شاعری میں بھی ان ملی جلی رسموں کی مشترکہ خصوصیات نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔

شادی زندگی کی اہم ترین تقریب ہے ہر شخص اپنے اپنے مقدور کے مطابق اسے پوری دھوم دھام سے منانا چاہتا ہے۔ عموماً اس موقع پر دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے۔ اکثر تو قرض اُٹھانے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ برات کے دن عجیب چہل پہل ہوتی ہے۔ عورتیں آج کے دن خاص طور پر سنگار کرتی ہیں۔ مہمانوں کے اُٹھانے بٹھانے کے لئے شامیانے، قناتیں اور نمگیریاں لگائی جاتی ہیں۔ انھیں طرح طرح سے سجاتے ہیں اور آتش بازی چھوڑتے ہیں۔ امیر لوگ حریر و دیبا کے فرش بچھواتے ہیں اور جگہ جگہ موتی اور جھالریں لٹکواتے ہیں۔ لوگوں کی تواضع کے لئے طرح طرح کے عطر، گلاب اور پان اور ہزار دوسرا سامان مہیا ہوتے ہیں۔ شادی کی تیاری کا حال نظیر اکبرآبادی کی زبانی سنیئے۔ یہ تیاریاں ہندو مسلمان دونوں میں کم و بیش اسی طریقے پر ہوتی ہیں:۔

جو باد نے پھاڑے خار و خسک، اور بادل پانی چھڑکائے
بانات قناتیں شمیانے دل بادل تمبو تنوائے
نمگیرے جھالر موتی کے کمخواب مشجر جھلکائے
گل فرش حریر اور دیبا کے خوش رنگ چمکتے بچھوائے
مقیش زری کے پچھے بھی پھر جا گہ جا گہ لٹکائے
گل عطر و گلاب اور پان دھرے، کستوری عنبر رکھوائے

---

[1] مظہر علی سندیلوی اپنی نواسی کے عقدِ ثانی پر تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "یہ رسم خلاف رواج و مطابق سنت نبوی رسول پاک کے اختیار کی ..... میں نے رسم قبیحہ کو دور کر کے سنت نبوی کو تازہ کیا ..... بیوہ کے عقد ثانی کا رواج مطلقاً قبیح ہذا میں نہیں۔" (۲۵ جنوری ۱۹۰۷ء) ایک نادر روزنامچہ ص ۱۸۵ نیز ملاحظہ ہو تذکرۂ شمیم سخن ۱۴/

[2] بیسویں صدی کے شروع تک ایسی شادیوں کا ذکر مفید عام آگرہ، پیسہ اخبار اور انڈین ببیل میں چھپا کرتا تھا۔ ایضاً ص ۵۰۔ ۴۹

[3] ایضاً ص ۵۰ [4] ایضاً ص ۴۹

پھر تھال: الائچی لوگوں کے بھر خوب طرح سے چنوائے
چنگیر دھریں سوزیب بھریں اور طرۂ ہار بھی گندھوائے[1]

بادشاہ محل صاحبہ نے اپنی "مثنوی عالم" میں جہاں قصہ کے ہیرو ہیروئن کی شادی کا ذکر کیا ہے، اس زمانے کی رسموں اور ریتوں کے حوالے بھی آ گئے ہیں۔ برات کی تیاری کے لئے کیا کیا التزام کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہو

(۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔)   دوسری شب برات کی ٹھہری
روشنی کے دو رویہ ٹر تھے   کئی تر پولیے بہت در تھے
تیل بیلے چنبیلی جوہی کا   لاکھوں من جونپور سے آیا
صرف ہوتا تھا تیل وہ ہر سو   ہر طرف پھولوں کی مہکتی تھی بو
وہ جو تر پولئے بنائے تھے   شیشہ آلات واں لگائے تھے[2]

دولھا کو اس موقع پر خاص طور سے سجاتے ہیں۔ مسلمانوں میں "نیچے کرتہ کرتے کے اوپر قبا یا انگرکھا، سر پہ دستار، دستار پہ گوشوارہ، شہزادوں میں موتیوں کا طرہ اور سہرا متوسط درجہ والوں میں پھولوں کا سہرا، پھولوں ہی کا طرہ، پھولوں ہی کی بدھی، اہل قلعہ میں بازو پر بھجبند۔۔۔۔ کمر میں ٹپکا ہاتھ میں پیش قبض دیا جاتا تھا"[3] ہندوؤں میں بھی دستار اور سہرا لازمی ہیں۔ دستار پر مکٹ باندھا جاتا ہے جو گوشوارے اور موتیوں کے طرہ سے مختلف نہیں۔ ممنون کے ان اشعار میں دولہا کے ساز و سامان کی کیسی سچی تصویر ہے!

وہ جیغہ وہ سرپیچ جوہر نگار   علد کو یہ اختر ہے دنبالہ دار
نہ الماس کے تکمہ کا ہے ظہور   گرہ ہو رہا ہے تجلی کا نور
وہ بازو پہ کیسا نورتن جلوہ گر   کئی رنگ کے پھول اک شاخ پر
کمر بند میں تکمۂ لعل ناب   شفق رنگ نصف النہار آفتاب
دلوں میں ہیں یہ کس کی شادی کے چاؤ   کہ ہے شاہدانِ چمن کا بناؤ[4]

یا موجودہ دور میں جگر بریلوی

جامہ نوشہ کو پہنایا   پیچی ٹیکا، سجا سجایا
گہنا پھولوں کا پھر پہنایا   رشکِ گلشن اُسے بنایا
باندھا اگلی تر کا سر پہ سہرا   ہنستا تھا زرد گھر پہ سہرا
لڑیاں سہرے کی جھومتی ہیں   کلیاں گالوں کو چومتی ہیں[5]

ادھر دلہن کو بھی بڑے چاؤ سے سنوارا جاتا ہے۔ دونوں مذہب والوں میں دلہن آج کے روز سرخ جوڑا پہنتی ہے آج ہی کے دن پہلی دفعہ مانگ بھری جاتی ہے۔ دونوں میں سہاگن بننے کی یہ اہم ترین نشانی ہے۔ مانگ سیندور سے بھرتے ہیں اور سہاگ پڑے کی خوشبودار چیزوں سے بھی جنہیں مروج کہتے ہیں۔ چوٹی، ٹیکا، جھمکا، نتھ، مسی، پان، کاجل، پا گھوڑے، کڑے اور حنا دلہن کے آرائش کے لوازم ہیں۔ ان میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں۔ ٹیکا خالص ہندوانہ چیز ہے۔ سولہ سنگار سے دونوں واقف ہیں۔ دلہن کی سہیلیاں اس کے سنگار کرنے میں آج کے دن اپنا سارا کمال صرف کر دیتی ہیں۔ ایسے دن روز روز نہیں آتے: میر حسن :

بھجوری گوندھی وہ پاکیزہ چوٹی   کہ سب اہلِ نظر کی جان لوٹی
جو ٹیکا اس کے ماتھے پر لگایا   قمر نے اپنے دل پر داغ کھایا
جب اُس کے کان میں پہنایا جھمکا   پریشاں ہو گیا عقدِ ثریا
پہن کر نتھ خوشی سے رنگ دمکا   وہ مکھڑا چاند سا گھونگھٹ میں چمکا
مسی آلود دنداں پیارے پیارے   چمکتے تھے شبِ یلدا میں تارے
بنایا خال کاجل سے ذقن پر   عجب جوبن تھا اس رشکِ قمر پر
چڑھی منہ پر دلہن کے ایسی شیریں   کہ پھیکی پڑ گئی نظروں میں شیریں
اگر ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے تھے   زرِ خالص کے زیب پا چھڑے تھے
بہت اس کے سوا بھی اور گہنا   مناسب جس کا جو تھا اس نے پہنا[6]

دونوں مذہب والوں میں دولھا گھوڑے پر سوار برات کے آگے آگے باجے کے ساتھ چلتا ہے۔ گھوڑے پر زرق برق ساز لگا کر کلابتوں کی جھالر سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اکثر گھوڑے کے پیچھے سَتہ بالا یعنی دولھا کا چھوٹا بھائی یا کوئی اور عزیز بیٹھتا ہے۔ برات دونوں مذہب والوں میں رات کو چڑھتی ہے

---

[1] گلزارِ نظیر، ص ۳۷۱
[2] مثنوی عالم، نواب بادشاہ محل صاحبہ، مطبع نامی لکھنؤ ۱۸۹۱ء، ص ۱۲۵
[3] سید احمد دہلوی، حوالہ ماقبل، ص ۷۷
[4] مناظرِ قدرت جلد ۴ ص ۸۴
[5] پیامِ ساوتری، جگر بریلوی، ص ۵۴
[6] میر حسن، مناظر قدرت ج ۴ / ۵۸

برات کیا ہوتی ہے، رنگ و نور کا سیلاب ہوتا ہے۔ شہنائی کی آواز نیک شگون سمجھی جاتی ہے۔ ہندو مسلمان دونوں کے ہاں شادی کے باجے میں شہنائی کا ہونا ضروری ہے۔ بادشاہوں کی برات میں زیور و ملبوس سے آراستہ ہاتھی بھی شامل ہوتے ہیں۔ داہنے اور بائیں سواروں کے پرے اور آتش بازی چھٹتی ہوئی اور پیچھے تختِ رواں پر اربابِ نشاط اور آرائش کی ٹٹیاں دونوں طرف مہتابیوں کی چمک اور فانوسوں اور کنولوں کی جگمگاہٹ عجب بہار دکھاتی ہے اور شادیانوں کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میرؔ نے آصف الدولہ کی شادی کے جلوس کو یوں بیان کیا ہے:

ہے سواری کے فیل کی وہ دھوم    جیسے ابرِ بہار آوے جھوم
آئے دولت سرا کے ہو کے سوار    لعلِ ناب و گہر ہیں صرف نثار
اک مہابت کے ساتھ فیل نشاں    آگے مانند کوہ زر کے رواں
اور ہاتھی ہیں جھومتے جاتے    جیسے آویں جوان مدھ ماتے
پلٹنیں جاتی ہیں برابر یوں    صف ہو مژگانِ دلبروں کی جوں
چوب نقارے پر لگا اس ڈھب    کہ رکھیں گوش اس صدا پر سب
پھینکتے ہیں جو دستہ دستہ گل    رہ گزر میں ہے رستہ رستہ گل[1]

برات چونکہ رات کو چڑھتی ہے، روشنی اور آتش بازی کے اہتمام سے جلوس کی شان دوبالا ہو جاتی ہے۔ میرؔ ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ماہ سے ماہتاب کی طرح    کس سے ہو لطف روشنی کی شرح
کیا ستاروں کا چھوٹنا کہئے    آسماں کی طرف ہی تک رہئے
دو طرف چھوٹتے جو ہیں گے انار    راہ ورستے ہوئے ہیں باغ و بہار
کاغذیں باغ کیا تماشا ہے    پھول کترا کہ گل تراشا ہے[2]

میر حسن:

دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے    پتنگ خوشی سے غزل خواں ہوئے
چراغوں کے تہ پلہ لئے جا بجا    ...ان میں وہ بازاریوں کی صدا
وہ ابرک کی ٹٹی وہ مینے کے جھاڑ    ...کہ تنکے کے اوجھل پہاڑ

۱ کلیاتِ میر، مرتبہ آسی، ص ۸۱-...۷
۲ ایضاً

دو رستہ برابر برابر وہ تخت    کسی پر کنول اور کسی پر درخت
اناروں کا دغنا پھپینے کا زور    ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور
اڑایا ستاروں کو جو آگ نے    تو ہاتھی لگے بن کو پھر بھاگنے[1]

برات شہر کے اہم مقاموں یا بازاروں سے گزرتی ہوئی دلہن کے گھر پہنچتی ہے۔ یہاں پھر ہر طرف چکا چوند کا عالم ہوتا ہے۔ جا بجا مکلف فرش بچھے ہیں۔ مسندیں لگی ہیں۔ پان دان، گلاب پاشی کا عطردان، چنگیریں قرینے سے دھرے ہیں۔ ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور تماشائیوں کی یہ کثرت ہے کہ دم گھٹتا ہے۔ میر حسن اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

جب آئی وہ دلہن کے گھر پر برات    کہوں واں کے عالم کی کیا تجھ سے بات
کھڑے بادلوں کے وہ خیمے بلند    کریں عالمِ نور جس کو پسند
عجب مسند اک جگمگی اور فرش    تمامی کے عالم کا چوکور فرش
بلوریں دھرے شمع داں بے شمار    چڑھیں بتیاں موم کی چار چار
نئے رنگ کے اور نئے طور کے    دھرے ہر طرف جھاڑ بلور کے
تماشائیوں کی یہ کثرت کے بس    ملے ایک سے ایک سب پیش و پس[2]

جس وقت دولہا دروازے پر پہنچتا ہے۔ دلہن کی طرف کے لوگ دو طرفہ قطار میں پیشوائی کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دولہا اور برات والوں کو ہار پہنائے جاتے ہیں، خوشبوئیں پیش کی جاتی ہیں۔ ہندوؤں میں دولہا کی آرتی اتاری جاتی ہے اور کہیں کہیں بیش قیمت ریشمی فرش بچھا کر دولہا کو مسند تک لاتے ہیں۔ نصرتی نے مثنوی گلشنِ عشق میں جہاں مالتی کی شادی کا احوال لکھا ہے، اس زمانے کی ایسی رسموں کا ذکر بھی کیا ہے:

ہر یک ٹھار خوباں لے ہت آرتیاں    حسین و جمیل عورتیں (تھالیوں میں چراغ
لگا لگ دسے شو او پر وارتیاں    سجائے) دولہا کی آرتی اتارنے لگیں۔
نول نور تن شو او پر کر نثار    زر و جواہر نثار کئے جانے لگے اور چلنے کے لئے
قمانشاں بچھا پاؤں تل زرنگار    زمین پر ریشمی کپڑے بچھائے گئے
صندل پھول سوں رکھ کو سمدیاں کا ماں    مہمانوں کو صندل پھول پیش کئے گئے اور
بولائے چلے شو کوں کر جیو پراں    دولہا کو سر آنکھوں پر لیا گیا۔

۱ سحر البیان ص ۱۹۹
۲ ایضاً ص ۲۰۰

بیاہا جشن کوں جوشش بے حد سے — جشنِ برات کی رونق اور رنگینی اندر سبھا
سبھا اندر کی تس ہنگامہ رد کیے[1] — سے بھی بڑھ گئی۔

برات کے استقبال کے بعد شادی کی رسموں کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ مسلمانوں میں نکاح پڑھا جاتا ہے اور سہرا باندھا جاتا ہے۔ یہ کم دلچسپ نہیں کہ نصرتی "بستانِ عقدِ منوہر و مدمالتی" کے موقع پر سہرا باندھنے کا ذکر کرتا ہے جو ایک اسلامی رسم ہے۔

جو قاضی فلک کار ہے مشتری — دیا عقد خواں کوں ادک یاوری
کتک ملک کا حال تس بھر بند — دیا عقد کا حکم کرنے انند[2]

مسلمانوں میں مہمانوں کی خاطر مدارات نکاح کے بعد کی جاتی ہے۔ شربت، الائچی، پان اور چکنی ڈلی اس موقع پر دونوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں یہ کام شادی پڑھنے سے پہلے ہوتا ہے کیونکہ شادی پڑھنے میں نسبتاً دیر لگتی ہے اور کبھی تو مہورت کے مطابق یہ کام کافی رات گئے شروع ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہندوؤں میں سہرا بھی عام طور پر برات کے استقبال کے فوراً بعد گایا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں سہرے کی رسم نکاح کے بعد کی جاتی ہے۔

سہرے کا رواج ہندوستان کی ملی جلی معاشرت کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ ہندوستان میں شادی بیاہ کے موقعوں پر رقاصاؤں کے ناچنے اور خوشی کے راگ گانے کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ ادھر عرب میں ایسے موقعوں پر قطعات کہے جاتے تھے جن میں مبارکباد اور تہنیت کے مضامین نظم ہوتے تھے۔ ایران میں بھی ان کا رواج رہا ہے۔ رودکی نے خود اپنے لڑکے کی شادی میں قطعۂ تہنیت کہا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے

ذکر تو بود زمزمۂ شادیٔ ما
لے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما

ہندوستان آنے کے بعد جب مسلمانوں نے مانیوں، بیٹھنے، گھڑیاں گانے اور سہرا باندھنے جیسی رسموں کو اہلِ ہند سے لے لیا تو مبارکباد اور تہنیت کے الفاظ بھی تبدیل ہونے لگے۔ اردو میں یہ نظمیں سہرے کے نام سے لکھی جانے لگیں۔ جہاں تک اردو شاعری سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ سہرے

---

[1] مثنوی گلشنِ عشق، نصرتی، ص ۱۰۹
[2] ایضاً ص ۱۸۹

لکھنے کا رواج صدی دو صدی سے زیادہ قدیم نہیں۔ سہرے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ روایتی سہرے ہیں جنھیں ڈومنیاں ہر موقع پر گاتی ہیں اور دوسرے وہ سہرے جسے شاعر دولھا کی شان میں لکھ کر خود پڑھتے ہیں یا اربابِ نشاط سے گواتے ہیں۔

ذوق اور غالب سے پیشتر سہرے کو کلام موزوں سے زیادہ وقعت نہ دی جاتی تھی۔ غالب اور ذوق کے سہرے اردو کے پہلے ادبی سہرے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اردو شاعروں نے سہرے کہے ہوں لیکن یہ ایک رسمی اور روایتی چیز تھی، شاعر اسے دیوانوں میں شامل کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ غالب اور ذوق نے اس پیش پا افتادہ اور فرسودہ مضمون میں اظہارِ خیال کے جو نکتے پیدا کیے اور زورِ تخیل کے جوہر دکھائے ان کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ سہرا بھی اصنافِ شاعری میں شمار ہونے لگا۔ ذوق اور غالب کے سہروں میں سخن ورانہ چشمک کا جو عنصر تھا اس نے بھی سہروں کو مقبول و مشہور بنانے میں مدد دی۔ چنانچہ اردو کے دوسرے شاعر بھی اس صنف کو منھ لگانے لگے اور بکثرت سہرے کہے جانے لگے، امیر مینائی، جلیل اور داغ نے اچھے سہرے لکھے۔ داغ کے سہرے رام پور اور حیدرآباد کے شہزادوں یا امیروں وزیروں کی شادیوں سے متعلق ہیں۔ ان کی اہمیت ایک خشک فریضے کے ادا کرنے سے زیادہ نہیں امیر مینائی نے نواب محمد حامد علی خاں نواب رام پور کے جشنِ عروسی پر ایک دو نہیں پورے بارہ سہرے کہے تھے۔ ان کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے[1]۔ شیو پرشاد وہبی شاگردِ قلق کے سہرے[2] سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ہندو مسلمان ایک دوسرے کی شادیوں پر سہرے لکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں سہرا کہنے کا رواج اتنا عام ہو چلا تھا کہ اردو کے یورپین شاعر بھی اس سے نہیں بچ سکے۔ چنانچہ جارج پیش شور[3] کو جب اور کوئی ہاتھ نہ آیا تو خود اپنا سہرا لکھ کر ارمان پورا کر لیا ... یہ ان کی دوسری شادی تھی۔ اس سہرے کے اشعار میں جو انداز انیسویں صدی اور ... شعرا اپنے سہرے اپنی جگہ کافی دلچسپ ہے۔

---

[1] مخطوطاتِ نظم اردو، نمبر ۲ ... رضا لائبریری، رام پور
[2] مرقعِ ارژنگ، کلیاتِ شیو پرشاد وہبی، ص ۱۸۴
[3] جارج پیش شور (۱۸۲۳ء – ۱۸۹۴ء) اردو میں ان سے کچھ دیوان یادگار ہیں۔ ملاحظہ ہو انڈو یوروپین کنٹری بیوشنز آف اردو اینڈ پرشین ۲۲۸/

شور صاحب کے بندھا آج جو سر پر سہرا
دو سرا تھا یہ مقدر میں مکرر سہرا

ساقیا دور چلے آج کہ دل خوش ہے مرا
گاڈنگا پی کے برانڈی کا میں ساغر سہرا [1]

اواخر انیسویں صدی کے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے سہرے نہ لکھے ہوں ۔ دورِ حاضر کے شاعروں میں ریاض خیرآبادی، ثاقب لکھنوی، سائل دہلوی، برق دہلوی اور خوشی محمد ناظر نے اچھے سہرے کہے ہیں لیکن اس ثبوت کے لئے کہ اس پامال صنف میں دادِ سخن دینے کے مواقع اب بھی باقی ہیں، حسرت موہانی اور میکش اکبرآبادی کے سہرے دیکھنے چاہئیں ۔ غالب اور ذوق کے سہرے اس قدر عام ہیں کہ انہیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ۔

سہرے گلے جلنے کے بعد عورتوں کی ریتیں رسمیں شروع ہو جاتی ہیں ۔ ان موقعوں پر عموماً جو گیت گائے جاتے ہیں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک ہیں ۔ اس کے علاوہ ہاتھی کے پاؤں تلے پانی کا طشت پھینکنے، بکرا ذبح کرنے انگوٹھے میں ہو لگانے، کھیر کھلانے، کاہے تل چبوانے، دلہن کی جوتی پر کاجل پارنے اور سرونج پسوانے کے جن توہمات کا رواج ہے وہ بھی دونوں میں ایک ہیں ۔ یہ رسمیں ایران یا عرب کی نہیں ہندوستان کی ہیں ۔ نبات چبانا، ٹونے گانا، نیگ رخصتی وغیرہ رسموں کا بھی اسلام سے کوئی تعلق نہیں انھیں مسلمانوں نے اہلِ ہند سے لیا ہے ان میں سے بعض رسموں کا ذکر میر حسن کے یہاں مثنوی سحر البیان میں ملتا ہے :

کسی نے پسائی سرونج آن کر
کوئی گالیاں دے گئی جان کر
سہاگا گئی کان کوئی لگا
گئی کوئی دولہن کی جوتی چھوا
وہ شیریں جو بیٹھی تھی شیریں بنی
نبات اس کی جیبیں بنے کو بنی
چٹائی نبات اس کو اس گھات سے
کہ ڈھکا دیا ہر گھڑی بات سے
زبس دل تو تھا اس کا ہر جا پہ بند
کبھی جائے اس نے چنی کر پسند
ذرا پاؤں پڑ کے اٹھا کے اڑا
نہیں اور ہاں کا عجب غل پڑا
عجب طرح کی رنگ رلیاں ہوئیں
کہ باتیں وہ مصری کی ڈلیاں ہوئیں [2]

---

[1] دیوان شور سوم / ۲۰۳

[2] سحر البیان / ۲۰۳

تسلیم سہسوانی

اک پرستار چلبلی اچپل
لائی جوتی پہ پار کر کاجل
کان سے اک لگا گئی چونا
چھیڑتی ایک ایک سے دونا [1]

آغا علی شمس لکھنوی شاگرد اختر

میراسنوں کا وہ ٹونے گانا
ہریالے بنے سلونے گانا
پریوں کے وہ قہقہے وہ گھاتیں
چھلوں کی وہ دل لگی کی باتیں
اک ہنس کے دکھا گئی انگوٹھا
کھلوا گئی اک دلہن کا جوٹھا [2]

مسلمانوں میں آرسی مصحف شادی کی ایک رسم ہے ، اسے " جلوہ " بھی کہتے ہیں ۔ دولھا دلہن کو سر جوڑ کر آمنے سامنے بٹھاتے ہیں ۔ بیچ بیچ میں تکیہ اور تکیے پر قرآن شریف رکھا جاتا ہے ۔ دولھا سورۂ اخلاص پڑھ کر دلہن کے منہ پر پھونکتا ہے ۔ اس کے بعد قرآن شریف پر آئینہ رکھ کر دولھا دلہن کے اوپر کوئی کپڑا ڈال دیتے ہیں تاکہ شرمائی ہوئی دلہن آئینے کے ذریعے اپنے اجنبی میاں کو دیکھ سکے ۔ دکن کی مثنویوں میں " جلوہ " کا ذکر عام طور پر ملتا ہے ۔

محمد قلی قطب شاہ نے جلوہ کے موضوع پر چھ نظمیں لکھی ہیں جو ان کے کلیات میں درج ہیں ۔ ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ " ان میں سے اکثر خود اس کی ( محمد قلی ) زندگی سے متعلق ہیں [3] ۔ " ان نظموں کے مطالعے سے اس زمانے کی رسم جلوہ کے طریقے معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ کم دلچسپ نہیں کہ حیدرآباد اور مضافات میں آج بھی جلوہ کے وقت محمد قلی کے لکھے ہوئے گیت گائے جاتے ہیں ۔

وجہی نے بھی مثنوی قطب مشتری میں جہاں وہ قطب اور مشتری کی شادی کا نقشہ کھینچتا ہے ، رسمِ جلوہ کا ذکر کیا ہے :

سو جلوا لگے دینے سب شاہ کوں
سلکھن سکی مشتری ماہ سوں
مشاطہ ہو حور آئے جنت تے چل
کہ پردا ہے اسماں تارے سو پھل
ملے قطب ہور مشتری ایک ٹھار
ہوا آج جگ میں انند بے شمار [4]

---

[1] مثنوی سعدین بحوالہ مثنویات (امیر احمد علوی) / ۹۲

[2] مثنوی طلعۃ الشمس مطبوعہ / ۱۲

[3] کلیات محمد قلی قطب شاہ ، مقدمہ ، ۲۳۵

[4] قطب مشتری ، ص ۱۰۶

نصرتی :-

کھڑی آکے مشاطہ زہرہ صفت — دکھانے لگی اپنے فن کی گت
جو چھند بند کے بول بولن لگی — برہ کی گرہ دل کی کھولن لگی
دونوں دھیر بر پل میں غالب ہو شوق — نکس یک کوں دیکھن سہریں ادیں ذوق
وہ پردہ ریح کی گرچہ دوری اتھی — نہ اتنی بھی ان بیس صبوری اتھی
ادسے دیکھ بینے کچھ انیس کام کوں — نظر بھر کے دیکھا دلارام کوں [۴]

ادھر یہ رسمیں ختم ہوتی ہیں ادھر جہیز نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ جہیز کا اصل مقصد یہ تھا کہ والدین بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے گھر بار کی ضروری چیزیں اور گھرداری کا کچھ سامان ساتھ دیا کرتے تھے تاکہ نیا گھر بار چلانے میں اُسے کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔ دولت مند اور غرض مندوں نے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا ورنہ جہیز ہر شخص کے مقدور اور بساط کے مطابق ہوتا ہے جن میں مقدور ہے وہ تو ماتھے سے پاؤں تک گہنے، ہاتھی، رتھ اور بہلوں کی جوڑی سے لے کر بیٹھنے کی چوکی تک جانے کیا کیا کچھ جہیز میں دیتے ہیں۔ اس سامان کی تفصیل نظیر اکبر آبادی نے لکھی ہے :

زر زیور کے واں ڈھیر لگے جو باہر ہووے گنتی سے
وہ موتی ہیرے انمولے وہ لعل زمرد کے ڈلے
وہ کلسے بٹے چاندی کے وہ تھال کٹورے سونے کے
وہ فرش سنہرے نقش بھرے جو بچھے محلوں بیچ پڑے
وہ چیرے خوب لباسوں کے اور گنتی میں بھی بہتیرے
وہ چیریاں اچھی صورت کی سر پاؤں تلک زیور پہرے
چنڈول جھمکے وہ جن پر بانات زری کے تھے پردے
نتھ بھلیں اور گھر بھلیں وہ ٹھاٹھ چمکتے جن کے تھے [۵]

اب دُلہن گھر سے رخصت ہوتی ہے۔ سہیلیاں، ہم جولیاں اس سے مل مل کے روتی ہیں۔ اس موقع پر ہندو مسلمان دونوں میں کہتے ہیں۔ "ہمارے گھر کی چھمی چلی۔" کم کم رونے کے اس عالم میں جب منڈھا یعنی رخصت کا گیت شروع کیا جاتا ہے تو دلوں پر عجب اثر ہوتا ہے اور سن سن کے کلیجے کٹے لگتا ہے

دیکھئے میر حسن کے ان شعروں میں دردمندی کا عنصر کتنا اثر آفرین ہے :

سحر کا وہ ہونا وہ ٹونے کا وقت — وہ دلہن کی رخصت وہ رونے کا وقت
کھڑے سب کا لاچار منہ دیکھنا — کہ یارب یہ کیا ہے جہاں پیکھنا
وہ دلہن کا رو رو کے ہونا جدا — وہ ماں باپ کا اور رونا جدا
نکلنے وہ جانا محل سے جہیز — کہ جوں چشم سے اشک ہو موج خیز
یہاں موت ہے اہلِ عرفان کو — کہ جانا ہے اک دن یونہی جان کو
چلے کے چنڈول جس دم کہار — کیا دو طرف سے زر اس پر نثار
کھڑے تھے جو واں چشم کو تر کئے — سو موتی انھوں نے نچھاور کئے [۱]

بادشاہ عالم صاحب :

وقتِ رخصت قریب تر آیا — دل یکایک سبھوں کا بھر آیا
جبکہ سکھپال آیا ڈیوڑھی پر — سارے گھر میں بپا ہوا محشر
دولہے نے لے کے گود میں اک بار — کیا سکھپال میں دلہن کو سوار [۲]

دلہن سکھپال میں سوار ہو کر زرق برق کپڑوں میں کھوئی ہوئی زندگی کی نئی منزل کو چل دیتی ہے۔ شہنائی کی دُھن اور صبح کا حسن نئی خوشیوں کی بشارت دیتے ہیں۔ دونوں مذہب والوں میں ڈولی عام طور پر دن چڑھنے سے پہلے ہی چلی جاتی ہے۔

شادی کے موقع پر سمدھنوں کا ایک دوسرے کو سٹھنے دینا ہندو مسلمانوں دونوں میں پایا جاتا ہے۔ سٹھنے ایک قسم کی منظوم پہلو دار گالیاں ہوتی ہیں جن میں ہنسی مذاق اور تمسخر کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اکثر یہ بد تہذیبی تک بھی پہنچ جاتی ہیں۔ سٹھنے دینا ایک خالص ہندوستانی رسم ہے۔ مسلمانوں میں سمدھنوں کی پیشوائی بھی ہندوانہ طریقے پر کرتے ہیں یعنی ہر سمدھن دوسری کے ماتھے پر اُنگلی سے صندل لگاتی ہے اور اُسے ہار پہناتی ہے۔[۳] پان زردے اور سپاری سے تواضع کرنا بھی ہندوستانی رواج ہے۔ زیادہ تر ایسے رواجوں کا سرچشمہ اہلِ قلعہ تھے۔ قلعہ میں ہندو رانیوں کی کمی نہ تھی اور ان کی بدولت ہندو تہذیب اور معاشرت کی بہترین روایات قلعہ میں

---

۱ سحر البیان ص ۲۰۴
۲ مثنوی عالم / ص ۱۲۴
۳ رسوم دہلی / ۶۹
۴ گلشن عشق ص ۱۰۹
۵ گلزار نظیر / ۳۷۷

داخل ہو گئی تھیں۔ وہاں سے دربار اور شہر یار کی مہر لگ کر یہ عوام میں مقبول ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ سٹھنے دینے کے رواج میں بھی اہلِ قلعہ سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے۔ شاہ عالم آفتاب کو سٹھنے لکھنے میں خاص مہارت تھی۔ ان کے لکھے ہوئے ۲۶ سٹھنے آج بھی ان کے ہندی اردو کلیات میں درج ہیں۔ ان میں سمدھی سمدھن کی تفریحات مثلاً بیڑا کھلانے، پھولوں کی چھڑیوں سے سمدھنوں کا رستہ روک لینے، پھولوں کی گیندیں مارنے، سر پر چھتر پھرانے، شربت پلانے، عطر ملنے اور ہار پہنانے کا ذکر ملتا ہے[1]۔ اردو کے کئی دوسرے شاعروں نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی۔ نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کا دیوان "دیوانِ شیریں" کے تاریخی نام سے ۱۲۸۸ھ میں چھپ چکا ہے۔ اس کے آخر میں "غزلیات در شان سمدھن" کے عنوان سے چند خاص غزلیں درج ہیں[2] یہ بطور سٹھنے کے لکھی گئی ہوں گی۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

منہ سے اپنے ذرا گھونگھٹ کو ہٹا دے سمدھن
تیرے مشتاق ہیں سب جلوہ دکھا دے سمدھن
پہلے ہو لینے دے جو جی کی ہمارے ہے خوشی
پھر تو جو چاہے وہ پیچھے سے سزا دے سمدھن

سٹھنوں کا جواب ترکی بہ ترکی دیا جاتا تھا۔ اس کا ثبوت رائے طوطا رام عاصی کے دیوان "نظمِ اودھ" سے ملتا ہے۔ انھوں نے غزل ہائے سمدھن اور جواب سمدھن دونوں لکھے ہیں: از جانب نوشہ:

مست مے سے جو ہو گئی سمدھن[3] . . . . . . . . . . . . .

سمدھن کی طرف سے اس کا جو جواب دیا جاتا اس میں نوشہ کی ماں اور بہن پر بطور خاص چوٹیں ہوتی تھیں مثلاً "کیا ہی عیار طرح دار تھی ماں نوشہ کی" یا "مے سے جب مست ہو جاتی ہے بہن نوشہ کی"[4] وقس علیٰ ہذا

شادی بیاہ کی مشترکہ رسموں کے سلسلے میں یہاں جلال الدین جلال

---

[1] نادراتِ شاہی، ص ۵۵، ۱۱۳، ۵۳، ۵۷، ۵۸ اور ۵۶ بالترتیب
[2] دیوانِ شیریں مطبع نظامی کانپور، لٹن لائبریری علی گڑھ، ص ۱۶۲
[3] نظمِ اودھ، ص ۵۱ } مطبع علوی ۱۲۷۱ھ رضا لائبریری، رام پور
[4] ایضاً ص ۵۳

کی ایک مختصر مثنوی کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ ایک باپ کو اپنی اولاد کی خاطر جن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے اور جن تکلفات کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے، ان سب کا ذکر اس مثنوی میں بے کم و کاست آ گیا ہے۔ مقدور ہو نہ ہو گہنا کپڑا ہزاروں کا بنتا ہے، رنڈیوں اور بھانڈوں کے بغیر شادی مکمل ہی نہیں ہوتی۔ آتش باز اگر نہ آئیں تو "دولت میں آگ کون دے" دام ہوں نہ ہوں، نام تو رہ جائے۔ یہ ہیں وہ دکھاوے کے طور طریقے اور خاندانی وضعداریاں جنھیں نبھانے کی خاطر ہندو و مسلمانوں کے ہزاروں گھر برباد ہو جاتے ہیں۔ اب تو خیر تعلیم کی روشنی اور اپنی تہذیبی قدروں کے احساس سے کچھ کچھ یہ رواج کم ہو چلے ہیں ورنہ ان پابندیوں سے کون آزاد تھا۔ گھر کی عورتیں مل کر میاں سے کہتی ہیں:

بیاہ بیٹے کا کچھ نہیں آساں … شرم رہ جائے وہ کرو ساماں
پہلے زیور ضرور ہوتا ہے … چار کے وہ حضور ہوتا ہے
خرچ کر دو کمائی کچھ دن کی … نتھنی لکھو پچاس پچپن کی
کان کی بالیاں بھی سو کی ہوں … چھلے پیروں کے آٹھ نو کے ہوں
جھومر چار سو کا سر کے لئے … سر کی زینت ہے ہر بشر کے لئے
بالے کانوں کے لکھو ستّر کے … بجلی پتّے لکھو بہتّر کے
ساٹھ کا چاہیئے گلے کو ہار … صدقہ بچّے پہ کر دو سب گھر بار
سو کا گھی تو منگا لیجئے فی الحال … ناک کٹ جائے جو کھلاؤ دال
شامیانہ بڑا منگا لینا … ایک دن پیشتر گڑا لینا
دھوپ میں چار بھائی سوکھیں گے … لمبی داڑھی پہ تیری تھوکیں گے
رنڈیاں آگرہ کی سائی دو … اُن کو جوڑی ہوئی کمائی دو
آتش بازوں سے کہہ دو آ جاویں … وہ بھی دولت میں آگ دے جاویں
نام اپنا جہاں میں رہ جاوے … اچھا اچھا زمانہ کہہ جاوے[1]

ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی معاشرت کا جیسے کہ وہ اردو شاعری میں ظاہر ہوتی ہے یہ صرف ایک پہلو تھا، جس میل ملاپ کا نتیجہ یہ معاشرت ہے اسی اشتراک کا نتیجہ اردو زبان ہے چنانچہ اردو شاعری کے آئینہ میں ہندوستانی معاشرت کا بھرپور عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مزید اور مستند معلومات ان مثنویوں سے حاصل ہو سکتی ہیں جو خاص طور پر شادیوں

---

[1] کلیاتِ محمد جلال الدین جلال، ۱۹۰۴ لٹن لائبریری علی گڑھ ص ۳، ۴ مطبوعہ مفید عام آگرہ۔

کے موقعوں پر لکھی گئی ہیں۔ دکن کے شاعروں میں قلی قطب شاہ، نشاطی اور شوقی نے ایسی مثنویاں لکھی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کی نظموں سے اس کی اپنی شادیوں کے حالات معلوم ہوتے ہیں[1]۔ کہا جاتا ہے کہ وجہی کی مثنوی قطب مشتری قلی قطب شاہ اور مشتری کے عشق اور ان کی شادی کی داستان ہے[2]۔ محمد عادل شاہ کی شادی اس کے وزیر مصطفیٰ خان کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس شادی کا احوال شوقی نے اپنی ایک مثنوی "میزبانی نامہ" میں لکھا ہے۔ اس مثنوی میں بھی اس زمانے کے رسم و رواج اور معاشرت کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے[3]۔

میر نے ایک مثنوی در بیان کدخدائی بشن سنگھ لکھی تھی۔ بشن سنگھ میر کے مربی راجہ ناگر مل کے پسر خورد تھے۔ یہ مثنوی دیوانِ میر کے ادارۂ ادبیات حیدرآباد والے نسخے میں موجود ہے۔ یہی مثنوی میر نے کچھ ترمیم کے بعد آصف الدولہ کی شادی پر ان کی خدمت میں پیش کر دی[4]۔ اس شادی کے حالات میر حسن نے بھی "مثنوی شادی" کے نام سے لکھے ہیں[5]۔ منیر شکوہ آبادی نے مثنوی "حجابِ زنان" میں اور حاتم علی بیگ مہر نے مثنوی "شارعِ مہر" میں شادی بیاہ کے رسم و رواج وغیرہ کو بڑی خوش اسلوبی سے اجاگر کیا ہے۔

"۱۲۶۷ھ میں لالہ حسین بخش واقف لکھنوی نے کنور دھنپت رائے کی شادی کے احوال میں ایک مثنوی لکھی اور ہندوؤں کے شادی بیاہ کی سب رسمیں نظم کر دیں[6]۔" منشی انوار احمد تسلیم سہسوانی کی "مثنوی سعدین" (۱۲۸۷ھ) میں بھی شادی بیاہ کی ان ہی مشترکہ رسموں کی طرف اشارے ملتے ہیں[7]۔

---

[1] کلیات محمد قلی قطب شاہ، ڈاکٹر زور، مقدمہ ص ۲۳۳

[2] دکن میں اردو ص ۶۳

[3] عبدالقادر سروری، اردو مثنوی کا ارتقاء ص ۶۹

[4] کلیات میر، مرتبہ آسی، ص ۸۰۷

[5] ڈاکٹر عبداللیث صدیقی کا بیان ہے کہ یہ مثنوی ۸۲-۱۷۷۸ء کے درمیان فیض آباد میں لکھی گئی۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۱۰۷-۱۰۶

[6] مثنویات ص ۵۴

[7] ایضاً ۹۲

منوہر لال شارب

# غزل

در پردہ بھی شوخ حقیقت افسانے بدنام ہوئے

تیرے ہی جلوؤں کی خاطر بُت خانے بدنام ہوئے

اس دنیا کی ریت یہی ہے کوئی کرے اور کوئی بھرے

مے کی مستی نے بہکایا پیمانے بدنام ہوئے

دل کی دنیا ہو آباد تو جنگل میں بھی ہے منگل

اپنی نظر کی ویرانی سے ویرانے بدنام ہوئے

عشق بچارا سیدھا سادا حُسن کی چالیں کیا سمجھے

شمع نے پہلے آگ لگائی پروانے بدنام ہوئے

عقل کا شیوہ وقت شناسی اور جنوں بیباک یہاں

فرزانوں نے بات بنائی دیوانے بدنام ہوئے

ہائے رے یہ دستورِ محبت ہائے رے یہ آئینِ وفا

ظلم کیا اپنوں نے لیکن بیگانے بدنام ہوئے

ظرف ہمیں میں جب نہیں شارب اس میں کیا ساقی کا قصور

مے خواروں کی کم ظرفی سے مے خانے بدنام ہوئے

# مسٹر عبدالرسول

## (بنگال کے ایک قومی کارکن)

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بالعموم اور بنگال کی قومی جد و جہد میں بالخصوص جن ہستیوں نے بڑی سرگرمی دکھائی تھی اُن میں مسٹر عبدالرسول کا نام نمایاں آتا ہے انھوں نے خود اعتمادی اور بے خوفی کے ساتھ کانگریس میں شامل ہو کر ملک اور قوم کی خدمت کی۔ اور جب کانگریس نے بنگال کی تقسیم کے خلاف ۱۹۰۵ء میں تحریک شروع کی تو اُس میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور پیش قدمی کرنے والوں میں رہے۔ چونکہ مسٹر رسول بنگالی تھے۔ اسی لئے لازمی طور پر اُن کا میدانِ عمل بنگال ہی رہا پھر بھی اُن کی قومی سرگرمیاں بنگال تک ہی محدود نہ تھیں اور وہ اپنے زمانہ کے صفِ اوّل کے مخلص خادموں اور بے باک لیڈروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ مگر زمانہ کی ستم ظریفی اور نا قدر شناسی کو کیا کہیئے کہ ہم میں سے بہت لوگ اُن کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ چہ جائکہ اُن کی قومی اور ملکی خدمات کو زندہ رکھتے اور سراہتے۔ اس مضمون میں اُن کی زندگی کے حالات پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مختصر سا مقالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

میرا اُن کا تعلق اُس وقت سے ہوا جب میں ہائی اسکول کے درجۂ ہشتم کا طالب علم تھا۔ خوبیٔ قسمت سے ایک بار ۱۹۰۵ء میں ملاقات ہوئی اور پھر اُس کے بعد بارہا مجھے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ مجھے اُن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

مسٹر عبدالرسول کی پیدائش ۱۸۷۸ء میں ہوئی تھی۔ اُن کے والد مولوی غلام رسول تریپورا ضلع کے ایک زمیندار تھے۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اُن کی والدہ نے نہ صرف اُن کی پرورش و پرداخت کی بلکہ اُن کی تعلیم و تربیت میں انتہا درجہ کوشاں رہیں۔ والد کے انتقال کے بعد مسٹر رسول اپنی والدہ کے ہمراہ کشور گنج چلے آئے اور وہیں ایک مکتب میں اُن کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اُن کی والدہ ایک نیک خصال اور تجربہ کار بی بی تھیں۔ مسٹر رسول نے جب ڈھاکہ ہائی اسکول سے میٹریکولیشن کر لیا تو اُن کی والدہ نے اُن کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان بھیج دیا۔ وہاں کچھ دنوں لیورپول اور لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اکسفورڈ یونی ورسٹی سے میٹریکولیشن کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد سینٹ جیمس کالج سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کیا اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے میڈل ٹمپل میں داخل ہوئے اور بی۔ سی۔ ایل کی ڈگری حاصل کی۔ اپنی والدہ کی اجازت سے انگلستان میں انھوں نے ایک انگریز خاتون سے شادی کر لی۔ انگلستان کے زمانۂ قیام میں شری اربندو گھوش سے اُن کی ملاقات ہوئی تھی اور تبادلۂ خیالات کا موقع بھی ملا تھا۔

۱۸۹۸ء کے اواخر میں مسٹر رسول ہندوستان واپس آئے اور ۱۸۹۹ء میں کلکتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ پہلے پہل تو انھیں اپنے پیشہ میں کامیابی نظر نہ آئی پھر بھی وہ مستقل مزاجی اور دیانت داری کے ساتھ کام کرتے رہے۔ چناں چہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کی کافی شہرت ہو گئی۔ صرف یہی نہیں کہ وہ اپنی پریکٹس میں کامیاب رہے بلکہ بہت دنوں تک کلکتہ یونی ورسٹی کے قانون اور انٹرنس کے ممتحن بھی رہے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے کبھی پیشۂ وکالت کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کو محض اپنا ذریعۂ معاش سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں رہ رہ کر یہ تڑپ اُٹھتی تھی کہ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے کیوں کر آزاد کرایا جائے۔ اس کا ذکر وہ کبھی کبھی ہم جیسے اسکول کے لڑکوں سے بھی کیا کرتے تھے اور دیس کو آزاد کرانے کی ترغیب دلایا کرتے تھے۔ پبلک جلسوں میں

وہ اس بیباکی اور دلیری کے ساتھ انگریزی حکومت کے مظالم بیان کرتے تھے کہ سُننے والوں کے دلوں میں آزادی کی ہر دوڑ جایا کرتی تھی۔ دیس کی بنی ہوئی چیزوں کے استعمال کرنے کی تحریک کو تقویت دینے میں وہ برابر پیش پیش رہا کرتے تھے۔ خاص کر مسلمانوں کو اُس کی اہمیت سمجھانے کی اَن تھک کوشش کرتے اور کہتے کہ بدیسی چیزوں کو چھوڑ کر اپنے دیس کی چیزوں کے استعمال کرنے میں ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی طرح مسلمانوں کی بھی فلاح مضمر ہے۔

جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں مسٹر عبدالرسول کانگریس کے صف اول کے لیڈروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ بنگال پرونشیل کانفرنس باریسال کے اجلاس میں انھوں نے صدارت کی تھی اور جو خطبۂ صدارت انھوں نے پڑھا تھا اُس کو عوام اور خواص دونوں نے پسند کیا تھا۔ خطبہ میں ملکی اور قومی مسائل پر بحث کرنے کے بعد اُنھوں نے خاص طور پر اپنے مسلمان بھائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے پُرزور الفاظ میں جو کچھ فرمایا تھا اُس کا اقتباس درج ذیل ہے:-

"انگریزی حکومت خواہ کچھ بھی رُکاوٹ پیدا کرے ہمارے لئے ہندوستان سے علٰحدہ رہنا ناممکن ہے۔ بھلا ہو یا بُرا یہاں ہندو اور مسلمان اس طرح گھُل مل کر رہتے چلے آ رہے ہیں کہ ان سے علٰحدہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ ہندو اور مسلمان ایک ہی مادرِ وطن کی اولاد ہیں۔ ہمارے سیاسی اور اقتصادی اغراض و مقاصد ایک ہی ہیں اور اُن کے حاصل کرنے میں ہمارا اشتراکِ عمل بھی ضروری ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا مذہب اس سے ہرگز نہیں روکتا۔ ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ چین اور نیز زنجبار کے مسلمان ہمارے مذہبی بھائی ہیں۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی معاملات میں ہمارے اغراض ہندوستان کے ہندو، عیسائی اور دوسرے باشندوں کے اغراض سے وابستہ ہیں مجھے بہت افسوس ہے کہ اس قدر صاف اور واضح حقیقت ہمارے مسلمان بھائیوں کی نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے عام طور پر کانگریس کی تحریک کو کامیاب بنانے میں ہندوؤں کا ہاتھ نہیں بٹایا ہے اور وہ کھنچے کھنچے رہے۔ مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ کبھی آپ لوگوں نے اس پر غور کیا ہے؟ کیا مسلمانوں کو انگریزی حکومت نے بہت کچھ نوازا ہے؟ یا وہ خود ہی کوئی قابلِ ذکر ترقی کر پائے ہیں؟ کچھ بھی نہیں بلکہ نتیجہ بالکل برعکس ہے۔ ہندو ہر صورت سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور مسلمان پیچھے کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ آخر اُس کی وجہ کیا ہے؟ اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے میں اپنے مسلمان بھائیوں کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ دیس کی آزادی کی تحریک سے علٰحدہ ہو کر وہ ہندوستان کا اور اپنا بے حد نقصان کر رہے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں سے میری درخواست ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ کو سوچیں اور اپنا غلط رویہ ترک کر دیں اور وطن کے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر دیش کی فلاح اور بہبودی میں سرگرم عمل ہو جائیں۔"

مسٹر عبدالرسول کے دل میں قوم کا درد تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کی باتوں میں اثر ہوتا تھا۔ کالج کے لڑکے تو ان پر نثار ہونا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کی انگریز بیوی بھی ہندوستان کی جنگِ آزادی میں کافی حصہ لینے لگیں۔

منجملہ اور صفتوں کے مسٹر رسول میں ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ حق بات کہنے یا لکھنے میں کبھی چوکتے نہیں تھے۔ جو کہتے وہ کر گزرتے۔ اور جو لوگ کہتے کچھ اور کرتے کچھ، اُن کو وہ اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ وقت کی پابندی کے لئے بڑی تاکید کیا کرتے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میں ان کو بردوان کے ایک جلسہ میں لے جانے کی غرض سے کلکتہ پہنچا۔ جب میں اور وہ ہوڑہ اسٹیشن پر پہنچے تو کچھ اور حضرات جو اُن کے ہمراہ جانے والے تھے پہنچ نہ سکے۔ ہم دونوں گاڑی پر سوار ہو گئے اور گاڑی چل دی۔ وہ لوگ اُس کے بعد والی گاڑی سے بردوان پہنچے تو مسٹر رسول نے اُن سے کہا "جو لوگ وقت کی پابندی نہیں کر سکتے اُن کو کم سے کم قوم کی خدمت کرنے کا شوق نہیں ہونا چاہیئے۔"

افسوس کہ مسٹر عبدالرسول جیسے خادمِ قوم کو اللہ نے بہت تھوڑی عمر عطا کی تھی وہ یکم اگست ۱۹۱۷ء کو صرف ۴۰ سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔

آئندہ اشاعت کے متوقع مضمون نگار

کاظم علی برق موسوی
عرشی رام پوری
حسن نعیم
امرتا پریتم
فیض الرحمٰن
اے۔ ایچ عابدی
ہری چند اختر

رابندرناتھ ٹیگور
مترجم: شانتی رنجن بھٹاچاریہ

# مجھے لوٹا دو

دنیا کے لوگ
آٹھوں پہر اپنے کام میں مگن رہتے ہیں
—— اور تو
گھر سے بھاگے ہوئے، بھٹکے ہوئے بچے کی طرح
آگ برساتی دھوپ میں
ایک درخت کے سایے تلے
سنسان وسیع میدان میں
—— اکیلا ——
دن بھر بانسری بجاتا رہا

——

ارے تو جاگ - آنکھیں کھول
دیکھ —— شعلے کہاں بھڑک اٹھے
کس کا سنکھ بج اٹھا
دنیا بھر کے عوام کو بیدار کرنے کے لئے

رونے کی آواز کہاں سے آرہی ہے
کہاں —— کس اندھیرے میں
قیدی —— یتیم مدد مانگ رہا ہے
ظالم ——
غریبوں کی عزت لوٹ کر
کمزور و ناتواں کا خون چوس کر
انھیں پامال و برباد کر کے
ان کے دکھ درد کی ہنسی اڑا رہے ہیں

ان اداس چہروں پر
صدیوں کے ظلم وستم کی کہانیاں ہیں
غریب بیچارے - جب تک کہ زندگی ہے
پیٹھ پر ہزار بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں
اور اپنے بعد
اولاد کو وارث کے طور پر چھوڑ جاتے ہیں
—— جہان کا بوجھ اٹھانے کے لئے

اس پر بھی
وہ قسمت کو نہیں کوستے
بھگوان کی برائی نہیں کرتے
انسان پر الزام نہیں دھرتے
—— اور نہ کسی کی شکایت کرتے ہیں

روٹی کے دو ٹکڑوں کے بل پر
زندگی کے ٹمٹماتے دیئے کو جلائے رکھتے ہیں
اور جب کوئی ظالم
ان ٹکڑوں کو بھی چھین لیتا ہے
جب انھیں موت کے بھیانک منہ میں دھکیل دیا جاتا ہے
تب بھی یہ ناداں بچے

یہ نہیں جانتے کہ ——
انصاف کے لئے کس در کو کھٹکھٹائیں
صرف ایک ٹھنڈی سانس بھر کر پکارتے ہیں
—— "بھگوان —— بھگوان ——"
اور خاموش موت کی نیند سو جاتے ہیں

---

ان سب نادان، اداس اور بے زبانوں کو
—— زبان دینا ہوگا
ان سب خشک سینوں کو
یقین سے بھرپور کرنا ہوگا
للکار کر کہنا ہوگا
تم سب سر بلند کر کے ایک ساتھ کھڑے ہو جاؤ
تم جن سے ڈرتے ہو
وہ ظالم
تم سے زیادہ کمزور ہیں
جب تم جاگو گے، ایک ہو جاؤ گے
تب —— وہ بھاگ جائیں گے، جھک جائیں گے
اگر تم ان کے روبرو کھڑے ہو جاؤ گے
تو —— وہ کتوں کی طرح دم دبا کر بھاگ جائیں گے

بھگوان اُن سے ناراض ہیں
جہاں میں ان کا کوئی مددگار نہیں
وہ اس لئے اپنے منھ سے بڑائی کرتے ہیں
کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ
وہ کمزور ہیں، نیچ ہیں، ڈرپوک ہیں

---

شاعر ——
آؤ اُٹھ آؤ
اگر تم میں زندگی ہے تو اسی کو ساتھ لے آؤ

## غزل

محبوب خزاں

کوئی قریب نہ آئے شکستہ پا ہوں میں — کرم تو ہے مگر انجام دیکھتا ہوں میں
مری نگاہ میں کچھ اور ڈھونڈنے والے — تری نگاہ میں کچھ اور ڈھونڈتا ہوں میں
غلط نہیں وہ جو شکوے اب آپ کو ہوں گے — بدل گیا ہے زمانہ بدل گیا ہوں میں
مجھے ستاؤ نہیں زندگی نگاہ میں ہے — فریب کھاؤ نہیں تم کو جانتا ہوں میں
زمانہ دیر فراموش تو نہیں اتنا — یہ ٹھیک ہے کہ بہت دیر آشنا ہوں میں
مرا غرورِ محبت کہ میں نہیں سمجھا — تری نظر نے کہا تھا کہ دلربا ہوں میں

پھر آ رہے ہیں خزاں کو نپلوں کے دن لیکن
یہ کچھ نہیں ہے جہاں تک سمجھ سکا ہوں میں

اس جہان میں رکھا ہی کیا ہے ؟
دُکھ، درد، آہ و فریاد
تاریکی ہی تاریکی۔ مفلسی و کمزوری
اس کے بدلے
روٹی چاہیئے، روشنی چاہیئے کھلی ہوا چاہیئے
قوت چاہیئے، صحت چاہیئے، چاہیئے امن کی زندگی
—— اور چاہیئے
ہمت و یقین سے بھرپور سینے

شاعر ——
غریبوں کی دنیا میں
تم صرف ایک بار لے آؤ
جنت سے بھرپور یقین کا تصور

---

(بنگلہ سے ترجمہ)

غلام نبی خیال

# عید ہُند رؤف

کشیری

عیدٲنز عاشقو بیۂ اَن ساے
بھرہ یوٚمسہ کی پیٚیا ئے .لو
تمناہ دوٚتلاٸے کمہٕ تان حاسے
بھرہ یوٚمسہ کی پیا ئے .لو

کینہ وٚرسنین پیٚۂ تلوار اہ
ہوچھ مژرہٕ پیٚیژہٕ لوگ ناراہ ہیوٚ
امنکٕ یا ہُو مارہٕ ناتز ھاسے
بھرہ یوٚمسہ کی پیٚیا ئے .لو

ہَر دِنٕ زردی تزٲج ژیٚنٕ باغس
ظاہراہ تزلہ وٚینٕ لالس داغ
ارمانوٚ کرہٕ پوشن ماسے
بھرہ یوٚمسہ کی پیٚیا ئے .لو

عَرفکٕ تزندراہ بجنت واراہ
پتز گال ہوٗن دیداراہ
شُفقن دوٚ پلنس اسپند زاسے
بھرہ یوٚمسہ کی پیا ئے .لو

.بوتہٕ دمہٕ وٚوند کِس سازس زیراہ
وٚیتز ھناوٗن مۂ تہٕ چھُم سیراہ
تزہ تہٕ وَن نغز لاہ میانہٕ خیالے
بھرہ یوٚمسہ کی پیا ئے .لو

## ہدیۂ عید

ترجمہ

آج چاہنے والوں نے پھر عید کو اپنے ہاں مدعو کیا ہے
میرے محبوب! میں تمہارے لئے شراب کے جام بھر کے رکھ دوں
دیکھ کہ وجدان میں آ کر تمنائیں گویا مچل رہی ہیں
میرے محبوب! میں تمہارے لئے شراب کے جام بھر کے رکھ دوں

جن سینوں نے بُغض اور کینے کو پالا تھا وہ چھلنی ہو گئے
جیسے سوکھی ہوئی گھاس دم زدن میں راکھ کا ڈھیر بن گئی
دیکھ کہ امن و اخوت کی فاختائیں فضاؤں میں پرواز کر رہی ہیں
میرے محبوب! میں تمہارے لئے شراب کے جام بھر کے رکھ دوں

کل ہرا چمن پژمردہ تھا لیکن آج وہ کیفیت نہیں
شاید گلِ لالہ کے سینے کا برسوں پرانا داغ مٹ جائے
ارمانوں نے پھولوں کی مالائیں بنا بنا کر رکھی ہیں
میرے محبوب! میں تمہارے لئے شراب کے جام بھر کے رکھ دوں

کل شام کا ہلال کس قدر بیدار بخت نظر آ رہا تھا
جبکہ ایک عرصے کے بعد اس نے اپنے درشن دئے
شفق نے اُس سے کہا کہ میں تمہارے لئے اسپند جلاؤں
میرے محبوب! میں تمہارے لئے شراب کے جام بھر کے رکھ دوں

میں بھی من کے اس میٹھے ساز کو جگا کر اسے چھیڑوں گا
کیونکہ میں ایک گہرا راز تم پر واضح کر رہا ہوں
اور اے میرے خیال! تو بھی تو ایک غزل سناتا جا
میرے محبوب! میں تمہارے لئے شراب کے جام بھر کے رکھ دوں


نومبر ۱۹۵۷ء




# ہندوستانی رقص اور مشہور رقّاص

ہندوستانی رقص کی بنیاد لوگوں کے مذہبی خیالات رہے ہیں۔ ہندوستان میں رائج بھرت ناٹیم کتھا کلی، منی پوری، کتھک اور لوک ناچوں میں پہلے تین رقص مذہبی جذبات پر ہی قائم ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ہو جانے کے بعد ہندوستانی رقص پر عربی اور فارسی تہذیب کا اثر پڑا۔ مسلمان حکمران بُت پرستی کے مخالف تھے۔ ان کے زمانے میں درباروں میں حکمرانوں کو خوش کرنے کی خاطر ہندوستانی اور غیر ملکی رقص کو ملا کر جو درباری ناچ بنا اسے کتھک کہتے ہیں۔

## بھرت ناٹیم

ہندوستانی رقص میں بھرت ناٹیم سب سے قدیم ہے۔ بھرت ناٹیم کے معنی ہیں — بھارت کا نرتیہ (ہندوستانی رقص)۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بھرت ناٹیہ شاستر لکھنے والے بھرت مُنی کے نام سے اسے بھرت ناٹیم کہتے ہیں۔ اس رقص کے اصول ناٹیہ شاستر میں دئے ہوئے اصولوں سے بہت زیادہ ملتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بھرت ناٹیم بھاو، راگ اور تال کا فن ہے اور ان تینوں الفاظ کے پہلے حروف یعنی بھ + ر + ت کے ملنے سے بھرت ناٹیم بنا ہے۔ بھرت ناٹیم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہاتھ، پاؤں، آنکھ، بھوں، سر اور گردن کے طرح طرح کے اشاروں سے کسی گیت یا واقعہ کا مطلب سمجھایا جاتا ہے۔



اس رقص میں جن خاص سازوں سے کام لیا جاتا ہے وہ مردنگ اور کھرتال ہیں۔ کبھی کبھی ستھائی سُر کے لئے طنبورے کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ رقص کے وقت بڑے خوبصورت چمکدار کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ ریشمی یا سوتی چمکدار ساڑھی پہنی جاتی ہے جو

نیچے ٹخنوں تک لٹکتی رہتی ہے اور اس میں چُنٹیں ڈال کر کانی گھیرا بنا لیا جاتا ہے۔ کمر میں ایک بہت خوبصورت چمکدار کپڑا باندھا جاتا ہے جو گھٹنوں تک لٹکا رہتا ہے۔ اس کی چُنٹیں بہت خوبصورت لگتی ہیں۔ مرد رقّاص جسم کے اوپر والے حصّے پر کچھ نہیں پہنتے۔ کنڈل اکرگھنی یا پیٹی اور سر کے زیور بہت نفیس اور خوبصورت ہوتے ہیں۔

## کتھ کلی

کتھ کلی رقص کا جنوبی ہند میں قریب قریب سب جگہ رواج ہے لیکن ہرے بھرے دھان کے کھیتوں اور اونچے اونچے ناریل کے درختوں سے بھرا جنوب مغربی کنارے کا سب سے نیچے کا علاقہ کیرلی اس رقص کا مرکز ہے کتھ کلی کے معنی ہیں 'کہانی رقص'۔ جیسا کہ اس کے نام سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کسی کہانی کو 'رقص ڈرامہ' کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ لیکن اس ڈرامہ کے کردار منہ سے نہیں بولتے۔ وہ سنگیت باجے اور رقص کے ساتھ ساری کہانی کو اپنے اعضا کی جنبش اور اشاروں کے ذریعہ ہی پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک بڑا حیران کُن ڈرامائی فن ہے۔ رامائن اور مہابھارت کی ساری کہانی منہ سے ایک لفظ بولے بغیر صرف اشارے اور اداکاری کے ذریعہ پیش کی جاتی ہے۔

کتھ کلی ناچ اکثر کھلے میدان میں ہی کیا جاتا ہے اور اس کے لئے عام ڈراموں کی طرح رنگ برنگے پردوں سے سجا ہوا اسٹیج نہیں بنایا جاتا۔ ڈرامہ کسی قدیم تاریخی کہانی کی بنیاد پر ہوتا ہے



اور اکثر ساری رات اور بعض اوقات کئی کئی رات چلتا رہتا ہے اس رقص میں عورتیں حصّہ نہیں لیتیں۔ زنانہ کردار لڑکے ادا کرتے ہیں لیکن اب کبھی کبھی عورتیں بھی حصّہ لیتی ہیں۔ کتھ کلی میں رقاصہ کے چہرے کو خاص طریقہ سے سجایا جاتا ہے۔ رام لیلا وغیرہ میں تو لکڑی یا مٹی کے بنے ہوئے چہرے پہن کر لوگ بھیس بناتے ہیں مگر کتھ کلی میں بھیس بنانے کا ایک اور طریقہ ہے۔ چاول کو پیس کر گاڑھا گاڑھا لیپ بناتے ہیں۔ چہرے پر ایک کان سے دوسرے کان تک لیپ لگاتے ہیں۔ چہرے کے باقی حصّہ پر ہرا رنگ لگایا جاتا ہے۔ رنگ لگانے کے بھی خاص طریقے ہیں۔ اچھے چلن کے اونچے کرداروں کے چہرے پر ہلکا ہرا رنگ ہوتا ہے۔ راکھششوں اور نیچ کرداروں کے چہروں پر چاول کے لیپ کی بہت سی تہیں جمائی جاتی ہیں۔ ناک کے چاروں طرف لال آنکھوں کے کنارے کالا اور ناک پر سامنے سفید لیپ لگایا جاتا ہے اور ان کی داڑھی لال رکھی جاتی ہے۔ اس طرح بناؤ سنگار سے ایک خاص خوبصورتی اور کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ جو لکڑی یا کاغذ وغیرہ کے مصنوعی چہرے لگانے سے نہیں آ سکتی۔

رقّاصوں کے زیور اور کپڑے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں ان کی جیکٹ بہت تنگ ہوتی ہے۔ گلے میں کئی طرح کے رنگ برنگے دوپٹے ہوتے ہیں خوب لمبے چوڑے گھیر کا سفید گھاگرا اور سر پر برما کے پیگوڈا مندروں کی بناوٹ کا مکٹ رہتا ہے۔ کتھ کلی رقص کے ایک گروہ میں اکثر ۱۰ رقّاص ۴ گانے والے اور ۳ ڈھول بجانے والے رہتے ہیں۔ اگرچہ کتھ کلی رقّاص محبت غم و الم، بہادری اور ہمدردی کے جذبات کو پیش کرنے میں بھی ہوشیار فن کار ہوتے ہیں۔ مگر بھیانک فضا پیدا کرنے میں دُنیا کا کوئی بھی رقّاص ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

## منی پوری

کہتے ہیں کہ منی پور کی ہر ایک دوشیزہ پیدائشی رقاصہ ہوتی ہے۔ سچ مچ منی پور فنکارانہ رقص کا گھر ہے۔ یہ اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وسیع ملک کے چار بڑے ناچوں میں سے ایک ناچ اس چھوٹے سے پچھڑے ہوئے علاقے کے نام پر منی پوری رقص کہلاتا ہے۔ منی پور میں ہر ایک سماجی اور مذہبی تہوار رقص اور مسرّت کا موقع بہم پہنچاتا ہے۔ منی پوری رقص پوری طرح سے مذہبی جذبات پر قائم ہے۔ منی پور کے ہر گاؤں میں رادھا کرشن یا کرشن بلرام یا چیتنیہ مہاپربھو کے مندر ہیں اور ہر ایک مندر کے ساتھ ایک رقص گاہ ہوتی ہے۔ زیادہ تر رقص میں رادھا اور کرشن کی پریم لیلائیں پیش کی جاتی ہیں۔ رادھا اور گوپیوں کے ساتھ بھگوان کی راس لیلا منی پور کا سب سے زیادہ دلچسپ رقص ہے۔ منی پور میں چار طرح کے رقص مروّج ہیں جن میں سے ایک میں تو صرف لڑکے رقص کرتے ہیں اور باقی تینوں میں لڑکے اور کنواری لڑکیاں حصّہ لیتی ہیں۔

رقاص اور رقاصاؤں کا لباس بہت بھڑکیلا، چمکیلا اور رنگ برنگا ہوتا ہے۔ کپڑوں پر شیشے کے ٹکڑے اور سنہرے اور روپہلے پتھر ٹانکے جاتے ہیں جو ہر طرف سے روشنی میں جھلمل جھلمل کرتے ہیں کرشن کی پیلی دھوتی، مور مکٹ گلے میں پڑی ہوئی بہت سی مالائیں اور کڑے اور کنڈل وغیرہ سب میں بہت چمک دمک اور خوبصورتی ہوتی ہے۔ رقص کے ساتھ ساتھ ڈھول بجانے والا تال دیتا رہتا ہے اور کبھی کبھی دونوں کا ایسا ملا جلا اثر پڑتا ہے کہ دیکھنے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ راس لیلا کے بعد منی پور کا سب سے زیادہ مقبول رقص "لائی ہروبا" ہے۔ "لائی ہروبا" کا مطلب ہے دیوتاؤں کے ساتھ رنگ رلیاں۔ یہ بھی ایک مذہبی رقص ہے لیکن اس میں دھوم دھام بہت ہوتی ہے۔



## کتھک

مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندوستانی رقص کا بڑی تیزی سے زوال ہوا۔ اس پر فارسی اور عربی تہذیب کا اثر پڑا۔ رفتہ رفتہ رقص کا مقصد اس وقت کے حکمرانوں کو خوش کرنا اور ان کی تفریح کا سامان مہیا کرنا رہ گیا۔ جنوبی ہند میں مسلمانوں کا اثر بہت کم پڑا۔ لیکن شمالی ہند میں رقص کی مذہبی بھاونا بالکل ختم ہو گئی۔ مسلمانوں کے زیر اثر جس نئے رقص کا آغاز ہوا اس کا نام کتھک ہے۔

کتھک رقص میں سارا دھیان طبلے کی تال کے ساتھ پیروں کی حرکت پر رکھا جاتا ہے۔ اسے پیروں سے زمین پر طبلہ بجانا کہہ سکتے ہیں۔ جس میں طبلے کی تال اور ٹھنک کا کام پیروں سے بندھے گھنگھرو کرتے ہیں کبھی کبھی ہاتھ بھی تیزی سے ادھر ادھر گھومتے ہیں۔ جس وقت رقاص اپنے پورے جوش میں ہوتا ہے اس وقت اس کا سارا جسم تو ساکن سا معلوم پڑتا ہے لیکن پیر بڑی جلدی جلدی چلتے رہتے ہیں۔ کتھک رقص میں ہاتھ پیر وغیرہ کی حرکت کوئی خاص مطلب ادا نہیں کرتی۔ یہ رقص اب خاص کر پیشہ ور رقاص اور رقاصاؤں کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔



## لوک ناچ

گاؤں میں رہنے والے ان پڑھ یا بہت کم پڑھے لکھے اور بالکل سادہ زندگی بسر کرنے والے لوگ فرصت کے اوقات میں اکٹھے ہو کر اپنی تفریح کے لئے جس طرح ناچتے گاتے ہیں اس کا نام لوک ناچ ہے۔ ملک کے ہر ایک حصے میں رہنے والے لوگ اپنے اپنے رسم و رواج اور رہن سہن کے مطابق طرح طرح سے رقص کے ذریعے اپنی تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں اس لئے ملک کے کونے کونے میں طرح طرح کے لوک ناچ رائج ہیں۔ ہماچل پردیش سے لے کر آسام تک ہمالیہ کی پہاڑی کے سلسلوں اور ترائیوں میں رہنے والے لوگوں کے اپنے اپنے لوک ناچ ہیں۔ بنگال، بہار، راجستھان، پنجاب، مدھیہ پردیش، سوراشٹرا اور جنوب کے ہر ایک پردیش کے الگ الگ لوک ناچ ہیں۔ بہار میں جھومر اور سنتھالی ناچ ہیٹی کا شیر ناچ، ہماچل پردیش کا پنگی ناچ، مدھیہ بھارت کا بنجارا ناچ، پنجاب کا بھانگڑہ اور گدا ناچ، اتر پردیش کا دیوالی کا ناچ اور بنگال کا نگر کیرتن وغیرہ سبھی ناچوں کی پوشاکیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ لوک ناچ دیکھنے والے لطف اندوز ہو کر خود بھی ناچنے لگتا ہیں۔ ان ناچوں میں رنگ برنگے کپڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔

جس طرح سیاست، سائنس، کھیل کود اور دوسرے میدانوں میں ہمت ور لوگوں نے آگے بڑھ کر ہندوستان کا سر اونچا اٹھایا ہے۔ اسی طرح کتنے ہی لوگوں نے دن رات محنت کر کے ہندوستان کے فنِ رقص کو بھی ترقی دی ہے۔ شاعر اعظم رویندر ناتھ ٹھاکر نے ہندوستانی فنِ رقص کے احیاء کیلئے بڑا ہی اہم کام کیا ہے۔ اودے شنکر، بالا سرسوتی، رکمنی اروندیل، رام گوپال، مینکا، تارا چودھری، گوپی ناتھ، اچھن مہاراج وغیرہ نے اپنی زندگی ہی ہندوستانی رقص کے فروغ کے لئے وقف کر دی۔ مشہور ہندوستانی رقاص اور رقاصاؤں نے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ غیر ملکوں میں بھی شہرت حاصل کی ہے اور اپنے دیش کی عزت بڑھائی ہے۔

## اودے شنکر

اودے شنکر نے اپنے رقص کی بدولت ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں شہرت حاصل کی ہے۔ شروع شروع میں وہ ایک مصور

تھے۔ اجنتا اور ایلورا کی غاروں اور جنوبی ہند کے مندروں میں سجی ہوئی دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کی تصویریں بناتے بناتے وہ انھیں تصویروں کی مانند وہی جذبات اپنے اوپر طاری کرنے لگتے اور اس طرح ان کی نقل کرتے گویا یہ تصویریں خود بہ خود زندہ ہو کر اُٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔

اودے شنکر کے رقص کو دیکھ کر یورپ اور امریکہ کے لوگ دنگ رہ گئے تھے۔ اسی قدیم فنِ رقص میں وہ پورے ماہر ہیں اور ان کا اعتقاد ہے کہ موجودہ زندگی کے نئے نئے مسئلوں کو حل کرنے کے لئے رقص سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ وہ سماجی اور سیاسی پرچار میں رقص سے کام لینا نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔

اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اُنھوں نے المورڑہ (یو۔پی) میں ایک کلا مندر کی بنیاد رکھی تھی۔ مگر چند وجوہ کی بنا پر اسے بند کر دینا پڑا۔ سب سے بڑی مشکل اقتصادی مشکل تھی۔ جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے وہ اپنے اس مرکز کے لئے روپیہ جمع کرنے کی غرض سے غیر ممالک کا سفر بھی نہ کر سکے۔



ان کی بیوی املا بھی ایک اچھی رقّاصہ ہیں۔ جب یہ اپنے پورے گروہ کے ساتھ رقص کرتے ہیں تو سچ مچ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی پریوں کے دیش میں پہنچ گئے ہیں۔ مگر جب رقص ختم ہو جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے گویا ہم نے اپنی کوئی بیش قیمت چیز کھو دی ہو۔ ان کے رقص کی ہر ایک کیفیت اور جذبات کی عکاسی یکے بعد دیگرے کچھ ایسا جادو کرتی چلی جاتی ہے کہ دیکھنے والے بُت بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ شنکر پاروتی کا رقص کرتے ہیں تو سچ مچ ایسا لگتا ہے کہ سورگ لوک سے بھگوان شنکر اور پاروتی اس دُنیا میں آ گئے ہوں۔

## بالا سرسوتی

بھرت ناٹیم کی مشہور و معروف رقّاصہ بالا سرسوتی نے بہت چھوٹی عمر سے ہی یہ فن حاصل کر لیا تھا۔ ان کا خاندان جنوبی ہند میں کئی پیڑھیوں سے ناچنے اور گانے کا کام کرتا رہا ہے۔ جنوبی ہند کے مندروں میں دیوداسیاں رکھنے کا رواج بہت زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ دیوداسیاں اپنے ناچ اور گانوں سے



بھگوان کو خوش کرتی ہیں جیسے ہر ایک مندر میں پُوجا کے لئے پجاری رہتے ہیں۔ اسی طرح وہاں ناچنے اور گانے کے لئے دیوداسیاں بھی رہتی ہیں۔ ان دیوداسیوں کے خاندان میں پیڑھی در پیڑھی گانے ناچنے کا ہی کام ہوتا ہے۔ اسی طرح کے ایک خاندان میں بالا سرسوتی نے جنم لیا۔ بالا کی ماں اور دادی اپنے زمانے کی مشہور مغنّیہ رہی ہیں۔ بالا سرسوتی بھی رقص و موسیقی دونوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ بالا سرسوتی کی اداکاری میں خاص طور پر ایک کشش اور اثر ہوتا ہے۔ جہاں تک آنکھوں کے ذریعے جذبات کے اظہار اور ہاتھ کے اشارے اور اداکاری کا تعلّق ہے کوئی دوسری رقّاصہ بالا سرسوتی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

## رام گوپال

رام گوپال نے رقص میں یکایک بڑی تیزی کے ساتھ شہرت حاصل کی۔ اودے شنکر کی طرح اُنھوں نے بھی چھوٹی عمر میں شہرت اور دولت دونوں چیزیں حاصل کر لیں۔ ان کے والد ہندوستانی اور ان کی والدہ برمی تھیں ان کے ہاتھوں کے لوچ اور پیروں کی اٹھان میں بڑی کشش ہے۔ شروع سے ہی انھیں رقص سے اُنس تھا۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ شروع میں گراموفون کی مدد سے ہی انھوں نے اس فن میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی اور جب امریکہ کی مشہور رقّاصہ لامیری منگول آئیں تو وہ رام گوپال سے اس قدر متأثر ہوئیں کہ انھیں اپنے ساتھ تمام دُنیا کا سفر

کرنے کے لئے
لے گئیں۔ یہ ان
کے لئے سنہری موقع
تھا۔ مشرقی ایشیا
جاپان، امریکہ اور
یورپ میں ان کے
فن کی دھوم
مچ گئی۔ ہندوستان
آکر انھوں نے اپنا
ایک گروہ تیار کیا
اور پھر یورپ گئے۔
اودے شنکر



کی مانند رام گوپال کے فن پر بھی مغرب کا اثر پڑا ہے۔ اسے خالص ہندوستانی فن نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے رقص میں ان کی اپنی جھلک رہتی ہے۔ ان کی اداکاری بڑی زوردار، پُر اثر اور لاثانی ہوتی ہے۔

## رُکمنی دیوی ارُونڈیل

بھرت نآٹیم کو اتنی بلندی پر لے جانے والوں میں شریمتی رکمنی دیوی اُرونڈیل کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ تنجاور کے ایک برہمن گھرانے میں ان کا جنم ہوا قدرت نے انھیں حد سے زیادہ خوبصورتی عطا کی تھی۔ کم سنی میں ہی ان پر تھیوسوفی کا اثر پڑا۔ اینی بیسینٹ نے ان کی قدرتی خصوصیات کو پہچانا۔ اور ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کی چنانچہ جلد ہی رقص کے میدان میں ان کی شہرت ہونے لگی۔



تھیوسوفی سے متاثر ہو کر ان کے خیالات بڑے بلند ہو گئے تھے۔ اپنے کُنبے اور سماج کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انھوں نے تھیوسوفی کے مشہور مبلّغ ڈاکٹر ارونڈیل نامی انگریز سے شادی کر لی۔ دونوں کی ازدواجی زندگی پُر مسرّت رہی۔ دونوں نے دُنیا کے تمام ممالک کا دَورہ کیا۔ اور رکمنی دیوی نے اپنے فن کے ذریعے دُنیا میں جگہ جگہ ہندوستان کی عزّت بڑھائی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رکمنی دیوی کو یہ فن خدا کی طرف سے ملا ہے۔ اُنھوں نے فنِ رقص سیکھا نہیں ہے بلکہ اس کو فروغ دیا ہے۔ بھرت ناٹیم کو بالکل کلاسیکی طریقہ پر فروغ دینے میں اُنھوں نے بہت محنت کی ہے اور وہ سچ مچ اِس فن کی سب سے بڑی نمائندہ ہیں۔

اُن کے خاوند نے ہمیشہ اس کام میں اُن کی حوصلہ افزائی کی۔ اس لئے اُن کی موت سے رکمنی دیوی کو کافی دھکا لگا تھا۔ اپنے جیون ساتھی کو کھو دینے اور عمر ڈھل جانے کی وجہ سے اب رکمنی دیوی وہ رقص پیش نہیں کر پاتیں جسے دیکھ کر ناظرین دانتوں تلے اُنگلی دبا کر حیران رہ جاتے تھے۔

## گوپی ناتھ

گوپی ناتھ کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں ان کے ہونٹوں میں اور ان کے ہاتھ پاؤں میں جذبات کے اظہار کی عجیب طاقت پوشیدہ ہے۔ جب وہ سٹیج پر آتے ہیں تو اُن کی آنکھیں اور اُن کی اُنگلیاں بولتی ہوئی معلوم پڑتی ہیں اور ساری کہانی دیکھنے والوں سے صاف طور پر کہہ دیتی ہیں۔



شروع شروع میں گوپی ناتھ نے ٹراونکور میں اپنے بھائی سے کتھاکلی رقص سیکھا۔ بعد میں

وہ کتھک کلی کی کوچین صنف کا مطالعہ کرنے کے لئے کیرل کلامنڈل میں داخل ہو گئے کلامنڈل میں کوچین کے طالب علموں کو ترجیح دی جاتی تھی اور ان کی حوصلہ افزائی زیادہ ہوتی تھی۔ اس لئے ٹراونکور میں گوپی ناتھ کی کچھ مخالفت سی کی گئی۔ لیکن انھیں رقص سے ایک قدرتی لگاؤ تھا اور ان کے دل میں ایک لگن تھی اس لئے جلد ہی ان کا وہاں کے اُبھرتے ہوئے فن کاروں میں شمار ہونے لگا۔

کلامنڈل میں ہی راگنی سے ان کا تعارف ہوا۔ وہ بھی وہاں کتھک کلی کی تعلیم حاصل کرنے آئی تھیں سب سے پہلے گوپی ناتھ بمبئی میں منظرِ عام پر آئے وہاں انھوں نے پہلی بار راگنی دیوی کے گروہ کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ گوپی ناتھ کو بمبئی میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ اس کے بعد انھوں نے راگنی دیوی کے ساتھ سارے ملک کا دورہ کیا اور اکثر سبھی جگہ دونوں نے ساتھ ساتھ رقص اور اداکاری میں حصہ لیا۔ گوپی ناتھ کا شوپاروتی کا رقص شرنگار لہری اور شکاری رقص بڑے مقبول ہو گئے تھے۔

کلامنڈل میں ہی گوپی ناتھ کی کوچین کی علیالی دوشیزہ تھنکمنی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کیرل صنف کے بھارت ناٹیم کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں بعد میں دونوں کی شادی ہو گئی۔ گوپی ناتھ نے تھنکمنی کو بھی اس فن کی تعلیم دے کر ایک کامیاب رقاصہ بنا دیا اور جب یہ جوڑی سٹیج پر رقص کے لئے آئی تو عوام پر خوشی کی لہر چھا گئی۔

فنِ رقص کو فروغ دینے میں شاعرِ اعظم رویندر ناتھ ٹیگور اور ان کے ادارہ شانتی نکیتن کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے

---

## معلومات

۱- بھارتی ودھان (دستورِ ہند) میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ دیوناگری رسم الخط میں ہندی بھارت یونین کی سرکاری زبان ہوگی اور اسے اس طریق پر فروغ دیا جائے گا کہ یہ بھارتی کلچر کے تمام اجزائے ترکیبی کے اظہار کا موزوں اور واضح ذریعہ بن جائے۔

۲- مرکزی حکومت نے ہندی کی اشاعت اور اس کے کوش (خزانے) کو نئے الفاظ سے مالا مال کرنے کے لئے ریاستوں اور رضاکار اداروں کو گرانٹیں دی ہیں چناں چہ اس مقصد کے لئے ان ریاستوں کے لئے جن میں ہندی بول چال کی بھاشا نہیں، لگ بھگ ایک لاکھ چودہ ہزار روپے کی گرانٹیں منظور کی گئی ہیں۔ دوسرے پنج سالہ پلان کے دوران میں ہندی کی توسیع و اشاعت کی غرض سے ریاستوں کو گرانٹیں دینے کے لئے ۲۵ لاکھ روپے مہیا کئے جائیں گے۔

۳- ہندی نہ بولنے والے لوگوں کو اپنی مادری زبان کے ذریعے سے ہندی سکھانے میں مدد دینے کے لئے ایک اسکیم بنائی گئی ہے۔ جس کے تحت ہندی اور ۱۲ دوسری علاقائی زبانوں میں دو بھاشاؤں کے حروف تہجی کے چارٹ تیار کئے جائیں گے اور ہر ایک زبان کے تین بہترین چارٹوں پر انعام دیئے جائیں گے۔

۴- جولائی ۱۹۵۲ء میں ہندی نہ جاننے والے مرکزی سرکاری ملازمین کو ہندی سکھانے کے لئے ایک اسکیم رائج کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں سردست تین درجوں کے نصاب تجویز کئے گئے ہیں۔ اعلان کے مطابق اب تک جتنے امتحان ہو چکے ہیں ان میں ۲۱۸۶ اُمیدوار کامیاب قرار دیئے گئے ہیں۔

۵- ہندی کی بنیادی گرامر کا انگریزی ترجمہ اور ہندی، نیز دوسری بڑی بڑی بھارتی زبانوں میں مشترک الفاظ کی ۱۲ دو بھاشائی فہرستیں تیار ہو کر چھپ رہی ہیں۔

۶- ہندی میں اچھے لٹریچر کی تیاری کی حوصلہ افزائی سے متعلق مرکزی سرکار کی اسکیموں کے تحت ہندی کتابوں کے مُصنّفین کو انعامات دیئے جاتے ہیں۔

۷- ہندی میں سائنسی اصطلاحات کی ڈکشنریوں کی تالیف و تدوین کی غرض سے سائنٹفک ٹرمینالوجی (سائنسی اصطلاحات) کا ایک بورڈ ۱۹۵۰ء میں قائم کیا گیا جس میں ممتاز سائنس دان اور لسانیات کے ماہرین شامل ہیں۔ اس وقت اس بورڈ کی رہنمائی میں ماہرین کی ۲۰ کمیٹیاں مختلف سائنسوں کے لئے کام کر رہی ہیں۔ ماہرین کی تین اور کمیٹیاں بھی بن چکی ہیں جو جلد ہی کام شروع کر دیں گی۔

# ڈال ڈال کے پات

## بور

نظیر صدیقی

لفظ 'بور' انگریزی زبان کے ان لفظوں میں سے ہے جس کا مناسب اور مکمل بدل اُردو میں نہیں ملتا لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اُردو بولنے والوں میں بور نہیں ہوا کرتے۔ دراصل بور ہر زبان کے بولنے والوں، ہر مذہب کے ماننے والوں اور ہر ملک کے رہنے والوں میں پائے جاتے ہیں۔ انسانی تاریخ کے تمام ادوار اور دُنیا کی تمام اقوام میں اور کوئی چیز مشترک ہو یا نہ ہو لیکن بور قسم کے لوگوں کا وجود یقیناً مشترک رہا ہے۔ ایک مشہور ادیب کا قول ہے کہ بور ذات پات کے بندھنوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ مجھے اس قول سے اگر اختلاف ہے تو صرف اس لئے کہ میں نے ہر ذات کے بور دیکھے ہیں۔ یہاں تک کہ بدذات قسم کے بوروں سے بھی میرا سابقہ پڑ چکا ہے۔

بعض لوگ اُردو میں 'بور' کو مغز چاٹ کہتے ہیں۔ لیکن میں لفظ مغز چاٹ کو 'بور' کا مناسب اور مکمل بدل اس لئے نہیں سمجھتا کہ بور قسم کے لوگ صرف مغز ہی نہیں چاٹتے اور بہت کچھ چاٹ جاتے ہیں مثلاً میں اپنے تجربے کی بات کہہ رہا ہوں اور کیا عجب یہ آپ کا بھی تجربہ ہو کہ بور دماغ چاٹنے کے علاوہ قیمتی وقت سے لے کر قیمتی سگرٹ تک چاٹ جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہاں آپ یہ کہیں کہ حضرت دماغ چاٹنا تو محاورہ ہے لیکن وقت چاٹنا اور سگرٹ چاٹنا محاورہ نہیں تو میں اس اعتراض کے جواب میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ بات کہتے یا سُنتے وقت محاورں کے چکر میں نہ پڑیئے ورنہ یہ چکر بھی آپ کا دماغ چاٹ جائے گا۔

دُنیا میں جس طرح امیروں اور غریبوں کے طبقے ہیں اس طرح بور قسم کے لوگوں کا کوئی طبقہ نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ لوگوں کے ہر طبقے اور ہر طبقے کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ جس طرح ہر بچے کے اندر ایک آدمی پوشیدہ ہوتا ہے اسی طرح ہر آدمی کے اندر ایک بور چھپا ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام لوگ ایک دوسرے کے پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بور کہا کرتے ہیں۔ یعنی ہر آدمی اپنے سوا دنیا کے ہر آدمی کو بور سمجھتا ہے۔ یہ اور بات کہ کوئی آدمی ادنیٰ درجے کا بور ہوتا ہے اور کوئی اعلیٰ درجے کا۔ کوئی گمنام بور ہوتا ہے اور کوئی بدنام بور۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا دُنیا کا ہر آدمی اپنے سوا دُنیا کے ہر آدمی کو بور سمجھتا ہے ممکن ہے آپ اسے مبالغہ سمجھتے ہوں لیکن میرے لئے یہ بات سرتاسر مشاہدے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ مثلاً اگر آپ شام کے وقت دفتر سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دوستوں سے ملیں اور گفتگو میں دفتر کی باتیں دفتری اصطلاحات میں بیان کرنے لگیں تو آپ کے تمام دوست آپ کو متفقہ طور پر بور سمجھنے لگیں گے لیکن آپ کو بور سمجھنے والوں میں اگر کوئی شخص خود اس عادت میں مبتلا ہو تو وہ ہرگز اپنے آپ کو بور نہ سمجھے گا۔ اس سے ملتی جلتی ایک مثال اور لیجئے۔ فرض کر لیجئے آپ بعض دوستوں کے ساتھ کہیں جا رہے ہیں۔ راستے میں آپ کا کوئی اور دوست آپ کو اتفاقاً مل جاتا ہے۔ آپ اخلاقاً اس سے دو چار باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر آپ کے ساتھ چلنے والے دوستوں میں سے ہر شخص کو آپ کے بور ہونے کا یقین آ جائے گا لیکن اگر یہی صورتِ حال ان میں سے کسی کو پیش آ جائے تو اُسے اپنے آپ پر بور ہونے کا شبہ تک نہ ہوگا۔ بعض اوقات لوگ جن باتوں کی بنا پر دوسروں

کو بور کہہ دیتے ہیں اُن ہی باتوں کی بنا پر اپنے آپ کو بقراط سمجھ بیٹھتے ہیں۔ لیکن اس جملے سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ بور اور بقراط کے درمیان کوئی رشتہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور بات کہ خدا ساز بور اور خود ساختہ بقراط میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ایک مشہور کہاوت ہے کہ بد اچھا بدنام بُرا۔ میں اس کہاوت سے واقف تو اس زمانے سے ہوں جب میں اسکول کا طالب علم تھا اور مجھے امتحان کے پرچے میں کہاوتوں کو جملوں میں اس طرح استعمال کرنا پڑتا تھا کہ اُن کا مفہوم واضح ہو جائے میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے بنائے ہوئے جملے سے بد اچھا بدنام بُرا والی کہاوت کا مفہوم میرے مولوی صاحب پر واضح ہو سکا تھا یا نہیں لیکن خود مجھ پر اس کہاوت کا مفہوم اُس دن ظاہر ہوا جب بعض دوستوں کے ساتھ سیر کرتے ہوئے سر راہے ایک جیّد بور سے ملاقات ہو گئی۔ میں اپنے دوستوں کو حضرت بور کی بوریت سے بچانے کے لئے ان سے ذرا الگ ہو کر گفتگو کرنے لگا یا یوں سمجھئے کہ حضرت بور کی گفتگو سُننے لگا۔ دراصل گفتگو سُننے سے زیادہ میں اس بات کی کوشش کر رہا تھا کہ ان سے جلد گلو خلاصی ہو جائے۔ لیکن میری کوشش کارگر نہ ہو سکی۔ بہرحال جب ان سے نجات پا کر دوستوں کے پاس آیا تو انھوں نے بڑے غضبناک لہجے میں کہا۔ یار تم سخت بور ہو، راہ چلتے بور کرتے ہو، میں نے جواب میں ٹھنڈی سانس بھر کر صرف اتنا کہا، بد اچھا بدنام بُرا، یاروں نے پوچھا، کیا مطلب؟ میں نے جلتے ہوئے بور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، بور ہونے کی بدی تو ان کے حصّے میں آئی ہے اور بدنامی میرے حصّے میں۔

جو لوگ بور ہونے کی حیثیت سے مشہور و مستند ہو جاتے ہیں ان کی ایک ہولناک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان سے ان کے ملنے والوں اور جلنے والوں کو نجات کسی قیمت پر میسّر نہیں آتی۔ اگر آپ ان سے بچنے کے لئے گھر میں نہ ہونے کا بہانہ کریں تو کسی دن کسی وقت وہ آپ کو بازار میں گھیر لیں گے۔ اور اگر آپ بازار میں ان کی نظر بچا کر اپنے گھر کی طرف بھاگیں تو گھر میں داخل ہونے کے پانچ ہی منٹ بعد وہ آپ کے دروازے پر دستک دیتے سُنائی دیں گے۔ اس وقت آپ کو پتہ چلے گا کہ آپ نے تو ان سے نظر بچائی تھی لیکن ان کی نظر آپ سے نہ بچ سکی۔ جب آپ بادلِ ناخواستہ دروازہ کھول کر ان سے ملیں گے تو وہ گفتگو بھی یہیں سے شروع کریں گے کہ بھئی! بہت دن ہو گئے تھے آپ سے ملے ہوئے جب بھی آپ کے یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ آپ باہر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی میں نے آپ کو نواب پور روڈ پر دیکھا تو خیال ہوا کہ اس وقت آپ گھر ہی کی طرف جا رہے ہوں گے۔ اتفاق سے آج مجھے چھٹی بھی ہے اس لئے میں نے سوچا کہ چلو ذرا اطمینان سے آپ ہی سے گپ شپ رہے۔ جب وہ اطمینان سے آپ کے یہاں بیٹھ جائیں گے تو پھر اُٹھنے کا نام نہ لیں گے۔ انھیں اس بات کا ہرگز خیال نہ ہوگا کہ ان کی طرح آپ کا وقت بھی خالی ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر بارہ بج چکے ہیں تو آپ کو کھانا کھانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو گی، یا نہیں۔ آپ ان سے نجات پانے کی اُمید میں پان پر چائے کا اور چائے پر کھانے کا اضافہ کرتے چلے جائیں گے پھر بھی آپ انھیں جہاں کا تہاں موجود پائیں گے۔ آپ انھیں ٹالنے کے لئے خاموشی سے کام لیں یا خود فراموشی سے لیکن وہ دو تین گھنٹے وقت ضائع کئے بغیر ٹلنے کے نہیں۔ اگر ان کے پاس گفتگو کے لئے کوئی نیا موضوع نہ ہوگا تو وہ دہرائے ہوئے لطیفوں کو دہرانا شروع کر دیں گے یا پھر ہر بات میں اپنی ذات یا اپنے باپ دادا کی ذات سے مثالیں پیش کرتے چلے جائیں گے، وہ بھی غیر ضروری تفصیل کے ساتھ۔ اگر وہ تین بجے یہ خیال ظاہر کریں گے کہ اب چلنا چاہیئے تو ساڑھے تین بجے کرسی پر سے اٹھیں گے اور آدھ گھنٹہ دروازے پر کھڑے ہو کر گفتگو کرنے کے بعد چار بجے دفع ہوں گے۔ ایسے لوگوں سے مل کر آدمی جسمانی طور پر تو جاں بحق نہیں ہوتا لیکن ذہنی طور پر جاں بحق ہونے کے تجربے سے ضرور آشنا ہو جاتا ہے۔

مستند قسم کے بوروں میں اللہ کوئی دلچسپ بات ہو یا نہ ہو لیکن ان کا ایک دوسرے کے پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بور کہنا یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک مرتبہ ایک مستند بور کے یہاں نشست ہو رہی تھی۔ باتوں باتوں میں ایک شاعر کا ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے انھیں اس لئے مدعو نہیں کیا کہ وہ بہت بور کرتے ہیں۔ میں ان کے اس جملے سے بے حد محظوظ ہوا اور میں نے محظوظ ہو کر ان کے جملے پر اتنا اضافہ کر دیا۔ "اور اس کام کے لئے آپ کا وجود کافی ہے۔" لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ اُس دن پیش آیا جب ایک بہت بڑے بور نے بڑے سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ نظیر صاحب! میں آپ سے سخت بیزار ہوں۔ میں نے دبی زبان سے پوچھا، اب تک تو لوگ آپ کی جانِ عزیز سے بیزار تھے۔ آپ کو مجھ سے بیزار ہونے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ فرمایا۔ یہ ضرورت اس لئے پیش آئی کہ قوم کو ہم آپ جیسے آدمی کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے کہا اور جناب کا اپنے متعلق کیا خیال ہے؟ کہنے لگے۔ میرا تعلق قوم سے اتنا نہیں جتنا قدرت سے ہے۔ اور قدرت کی مشیّت کے متعلق آپ کا کچھ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ آپ کا تعلق نہ مذہب سے ہے نہ مولانا مودودی سے۔ چناں چہ

میں خاموش ہو رہا اور وہ دفع ہو گئے۔

بور کی قسمیں متعین کرنا مشکل ہی نہیں محال بھی ہے۔ بور انسان کے ہر طبقے اور علم و فن کے ہر شعبہ میں پائے جاتے ہیں۔ آپ اپنی سہولت کے لئے بہت سے بوروں کے نام رکھ سکتے ہیں لیکن بہت سے بور ایسے بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ مثلاً اگر کسی اسکول کے کوئی مولوی یا ماسٹر صاحب اپنے طالب علموں کو یہ بتائیں کہ غزل کے ہر شعر میں 'معشوقِ حقیقی' کا ذکر ہوتا ہے تو آپ انھیں 'تعلیمی بور' کہہ سکتے ہیں۔ یا اگر کوئی شخص کسی بڑے لیڈر کی تقریر سے پہلے سامعین کا دل بہلانے کے لئے اپنی تقریر سے ان کی سمع خراشی شروع کر دے تو آپ اسے 'سیاسی بور' کا خطاب دے سکتے ہیں۔ یا اگر کوئی شاعر کہے کم اور سنائے زیادہ یا اپنے اشعار سناتے وقت آپ سے داد کم لے اور خود ہی اپنے شعر کی زیادہ داد دے تو آپ اسے ادبی بور کہیں گے؟ لیکن آپ اس بور کو کیا کہیں گے جس کا خلوص یا جس کی خاکساری آپ کے اندر خودکشی کے جذبے کو بیدار کرتی ہو یا آپ کسی اسکول کے اس ہیڈ ماسٹر اور کسی کالج کے اس پرنسپل کو کس قسم کا بور کہیں گے جو طالب علموں کو تعلیم دینے سے زیادہ اُن کا امتحان لینے کے درپے رہا کرتا ہو اور اس بات کا ذرا بھی لحاظ نہ رکھتا ہو کہ طلباء کے علم کا امتحان لینے میں اساتذہ کے صبر کی بھی آزمائش ہو جاتی ہے یا آپ ان ایڈیٹروں کو بوروں کی کس صف میں رکھیں گے جو مشہور ادیبوں اور شاعروں کی بے جان چیزوں کو غیر معروف اربابِ قلم کی جاندار تخلیقات پر ترجیح دیتے ہیں؟ یا آپ اس شخص کو کس قسم کا بور قرار دیں گے جو یہ دیکھنے کے باوجود کہ آپ آدھے درجن دوستوں کے ساتھ کہیں جا رہے ہیں آپ کو راستے میں روک کر آدھ گھنٹے تک مزاج پرسی کرنے لگتا ہے۔

میرے ایک دوست ہیں جو ہر چیز کا ڈانڈا ادب سے ملاتے ہیں۔ میرا کوئی ٹھیک نہیں کہ میں کس وقت کس چیز کا ڈانڈا کس چیز سے ملا دوں۔ غالباً میری اسی خوبی یا خامی کے پیشِ نظر ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ادب میں جمود کے کیا معنی ہیں۔ میں نے بے ساختہ جواب دیا کہ ادب میں بوریت کا دوسرا نام جمود ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بے ساختہ جواب کا سوچ سمجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چناں چہ میرا یہ جواب بھی نہ سوچ سے تعلق رکھتا تھا نہ سمجھ سے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا یہ جواب آپ کو سوچنے کی بھی دعوت دے رہا ہو گا اور سمجھنے کی بھی۔

بعض اوقات بور کرنے والے کے بغیر بھی آدمی بور ہونے لگتا ہے۔ چناں چہ میں نے اپنے بعض دوستوں کو کہتے سنا ہے کہ "یار، گھر میں بیٹھے بیٹھے طبیعت سخت بدمزہ ہی تھی۔ اسی لئے تمھارے پاس چلا آیا ہوں۔" لیکن ایسے احباب میرے پاس صرف آنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مجھے بھی بور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس میں ان کے ارادے کو دخل ہو یا نہ ہو انسانی نفسیات کے اس اصول کو ضرور دخل ہوتا ہے جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را، آپ چاہیں تو اس مقولے کو یوں بھی پڑھ سکتے ہیں کہ بور شدہ بور کند انجمنے را۔

بور کرنا ایک فن ہو نہ ہو لیکن حصولِ مقصد کا ایک حربہ ضرور ہے۔ بعض لوگ اس حربے کے استعمال میں طاق ہوتے ہیں۔ انھیں اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ کس آدمی کو بور کرنے سے کون سا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ چناں چہ بعض ادیب ریڈیو کے پروگرام ایگزی کیوٹیو کو بور کر کے ریڈیائی پروگرام حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض شعرا مشاعرے کے سیکریٹری کو بور کر کے مشاعرے کا دعوت نامہ حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض بے روزگار لوگ بعض افسروں کو بور کر کے ملازمت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور لیڈر حضرات کا تو پوچھنا ہی کیا ہے وہ قوم کو بور کر کے ووٹ سے

## غزل

نشان الحق حقی

تجھے اے دشمنِ ایماں کہیں کیا کس قدر چاہا
کہ بہتر جان کر پوجا ستمگر جان کر چاہا

نہ پوچھو جرعۂ آبِ بقا کی تلخیاں ہم سے
کہ جھیلی جانکنی پیہم جو جینا لمحہ بھر چاہا

ترے اُس کشتۂ تیغِ ادا کو مرحبا جس نے
نہ جلنا آگ میں سیکھا نہ کھنچنا دار پہ چاہا

وہ کیا غم تھا خدایا جس کی خاطر ہم نے دل پایا
وہ سودا کون سا تھا جس کی خاطر ہم نے سر چاہا

نظر اُس انجمن سے پھیر بھی لیجے تو کیا حاصل
خیالوں کا ہے یہ عالم کہ جا نکلے جدھر چاہا

ہنر کیا، عیب کیا، حقی زہے وہ قدرداں میرے
جنھوں نے عمر بھر مجھ کو سمجھ کر بے ہنر چاہا

(نشور کراچی)

لے کر وزارت تک حاصل کر لیتے ہیں۔ غرض کہ بور بن جانا بھی عجیب نعمت ہے۔ یہ اور بات کہ میرے ایسے لوگ اس نعمت پر ہمیشہ لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

بور قسم کے لوگوں کا بد صورت یا بے وقوف ہونا ضروری نہیں۔ سچ پوچھیے تو یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ ان کے لئے کیا کچھ ہونا ضروری ہے ——————

—————— اور کیا کچھ ہونا ضروری نہیں۔ مشاہدے نے مجھے بتایا ہے کہ بے وقوف سے عقل کی باتیں سرزد ہوں یا نہیں لیکن عقل مندوں سے حماقتیں اکثر سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ پھر جب عقل مندوں سے حماقتیں ممکن ہیں تو حسین اور ذہین آدمیوں کا بور ہونا کیونکر ناممکن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حسین اور ذہین آدمی بھی بور ہوا کرتے ہیں۔ اگر آپ حسین یا ذہین نہ ہوں تو میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ حسین بور اور ذہین بور میں ایک چیز مشترک بھی ہوتی ہے۔ اس قدرِ مشترک کا نام ہے مظاہرہ۔ حسین آدمی اپنے حسن کے مظاہرے سے بور کرتا ہے اور ذہین آدمی اپنی ذہانت کے مظاہرے سے۔

جس طرح آج تک اس بات کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ محبت کی جاتی ہے یا محبت ہو جاتی ہے اسی طرح غالباً قیامت تک اس کا بھی فیصلہ نہ ہو سکے گا کہ بور کرنے والے بور کرتے ہیں یا بور ہونے والے خواہ مخواہ بور ہوتے ہیں، اس بات کا فیصلہ مشکل یا محال یوں ہے کہ جن بے چاروں کو بور سمجھا جاتا ہے ان کی ہر بات اور ہر ادا بور ہونے والوں پر گراں گزرتی ہے۔ چناں چہ بور کرنے والے کبھی اپنی محبت سے بور کر جاتے ہیں اور کبھی اپنی عقیدت سے، کبھی اپنی حماقت سے اور کبھی اپنی ذہانت سے، کبھی اپنی صورت سے اور کبھی اپنی سیرت سے، کبھی اپنے اخلاق سے اور کبھی اپنے اخلاص سے، کبھی خود ستائی سے اور کبھی دوسروں کی مدح سرائی سے، کبھی اپنی سادگی سے اور کبھی اپنی سادہ لوحی سے، کبھی اپنے تکلّف سے اور کبھی اپنی بے تکلفی سے، کبھی اپنے مذاق سے اور کبھی اپنی بد مذاقی سے، کبھی اپنے اصول سے اور کبھی اپنی بے اصولی سے، کبھی اپنے علم سے اور کبھی اپنی کم علمی سے، کبھی اپنے قد کی لمبائی سے اور کبھی اپنے دماغ کی چھوٹائی سے، کبھی اپنی سخن سنجی سے اور کبھی اپنی سخن فہمی سے، کبھی اپنی شاعری سے اور کبھی اپنی مضمون نگاری کبھی ترنّم سے غزل پڑھ کر اور کبھی تحت اللفظ مضمون سُنا کر۔ کیا عجب کہ آپ خاکسار کے اس مضمون سے بھی بور ہو رہے ہوں اور تحت اللفظ پڑھنے سے بھی۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ کی زبان سے میرے لئے لفظ 'بور' نکلے میں اپنی زبان بند کئے لیتا ہوں۔

(بشکریہ "لیل و نہار")

ع۔م

# نئی کتابیں اور رسالے

## گُل ہائے پریشاں

مرتّب الیاس احمد ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج ۔ضخامت ۴۸۴ صفحات ۔ کتابت ، طباعت ، کاغذ عمدہ۔

اردو اور فارسی کے منتخب اشعار کا یہ گل دستہ بڑی محنت اور بڑے سلیقے سے آراستہ کیا گیا ہے ۔ چھ سات ہزار کے قریب اشعار پر مشتمل یہ انتخاب حقیقت میں انتخاب لاجواب ہے ۔ انتخاب مختلف عنوانات کے تحت ہے ۔ حمد ، نعت ، حُسن ، عشق و محبّت ، عاشق ، معشوق ، سراپائے عاشق سراپائے معشوق ، مصائبِ عاشق ، مذہب سے متعلق مضامین ، خمریات ، مناظرِ قدرت ، اخلاقیات اور بہت سے دیگر موضوعات پر غزل کا انتخاب اس مجموعے کا طرۂ امتیاز ہے ۔ مرتّب نے قانونی موشگافیاں کرتے کرتے اتنا وقت نکالا کہ طویل مدّت کے مطالعے اور محنت کے نتیجے کے طور پر یہ انتخاب قدر دانانِ سخن کو پیش کیا۔

اگر کسی شعر سے متعلق کوئی لطیفہ یا حکایت ہے وہ بھی درج ہے۔ اساتذۂ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں ۔ سینکڑوں سرخیوں کے تحت اشعار شاملِ کتاب ہیں ۔ کوئی انتخاب مکمّل و جامع نہیں ہو سکتا لیکن یہ انتخاب کم از کم اس قسم کے دوسرے انتخابات سے بہتر ضرور ہے ۔

نعت کے عنوان کے تحت شمس تبریز ، خسرو ، حافظ سے لے کر اقبال سہیل تک ایک سلکِ عقیدت مرتّب نے پروئی ہے لیکن قدسی اور گرامی کی نعتیں یا ان کے نعتیہ اشعار اس میں نہیں۔

مرحبا سیّد مکّی مَدَنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
(قدسی)

کوثر چکد از لبم بایں تشنہ لبی
خاور دمد از شبم بہ ایں تیرہ شبی
اے دوست ادب کہ در حریمِ دلِ ماست
شاہنشہِ انبیاء رسولِ عربی
(گرامی)

مرتّب کا ذوقِ شعر بہت پاکیزہ ہے اس لئے گھٹیا اشعار اس انتخاب میں نہیں ملتے ۔ اہلِ علم کے لئے یہ کتاب گنجینۂ علم ہے اور اہلِ ذوق کے لئے داستانِ شوق ۔ غزل کا صحیح اور کلاسکی ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کتاب میں دلچسپی کا بیش بہا سامان ہے ۔ اس دور میں جب کہ اردو کی اچھی کتابیں کم چھپتی ہیں اس کتاب کو صرفِ کثیر سے شائع کرنا مرتّب کے شغفِ علمی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ان کے اس کارنامے کی داد اسی صورت میں دینے کی ضرورت ہے کہ یہ کتاب ہر اُس لائبریری کی زینت بنے جس میں اردو کی ایک بھی کتاب موجود ہے ۔

ملنے کا پتہ کتابستان الٰہ آباد قیمت ۷ روپیہ ۸ آنہ فی جلد

## دیوانِ غالب

مرتّب مالک رام ، ناشر آزاد کتاب گھر دلّی قیمت ۵ روپے ۸ آنے فی جلد ۔ ضخامت ۳۶۰ صفحے ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ، کتابت ، طباعت عمدہ ، کاغذ اوسط جلد اور جلد پوش دیدہ زیب ۔

دیوانِ غالب کے جتنے نسخے اب تک شائع ہوئے ہیں یہ نسخہ ان سب

سے زیادہ مکمل ہے۔ مرتّب غالبیات کے مشہور و معروف ماہر ہیں۔ موصوف نہایت پاکیزہ علمی ذوق رکھتے ہیں۔ آپ نے اردو کی گراں بہا خدمات ادا کی ہیں۔ دیوانِ غالب کا ایک صحیح انتخاب مرتّب کرنے کے لئے ان سے زیادہ موزوں اور کون ہو سکتا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ آپ کے قلم سے درج ہے جس میں غالب کی شعرگوئی، اس کا پس منظر اور اس کے دواوین کی اشاعت کی تفاصیل درج ہیں۔ انتخاب میں جہاں کسی لفظ یا ترکیب کے باب میں مختلف نسخوں میں اختلاف ہے اُسے حاشیے میں واضح کر دیا ہے۔ اس دیوان کا متن مطبعِ نظامی کان پور کے ایڈیشن (۱۸۶۲ء) پر مبنی ہے۔ غالب نے مطبعِ احمدی کا متن دیکھ کر اور اسے درست کر کے دیوان مطبعِ نظامی میں چھپوایا اس لئے یہ متن خود غالب کا طے کردہ ہے۔

غالب نے اپنے دیوان کا جو دیباچہ خود لکھا تھا مقدّمے کے بعد درج ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انتخابِ دیوان کا کام ۴ ۲ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ (۱۶- اپریل ۱۸۳۳ء) سے پہلے ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس میں غالب نے انتخاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے علاوہ جو منتشر اور پراگندہ کلام دستیاب ہو اُسے مجھ سے منسوب نہ کیا جائے۔

سب سے دل چسپ بات اس نسخے سے متعلق یہ ہے کہ لیتھو کی چھپائی جو ایک سو سال پہلے نامعتبر تھی آج بھی اپنی ضد پر قائم ہے۔ غالب ہوں یا مالک رام سبھی اس کے شکوہ سنج ہیں۔ اس دیوان کے ساتھ ایک غلط نامہ بھی شامل ہے جو زبانِ حال سے کہہ رہا ہے ع

این گناہیست کہ درِ شہر شما نیز کنند

موجودہ حالات میں دیوانِ غالب کا یہ سب سے مستند اور معتبر نسخہ ہے۔

## رسالے

**کراچی یونی ورسٹی میگزین** (پہلا شمارہ) نگران ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صدر شعبۂ اردو کراچی یونی ورسٹی۔ ادارۂ تحریر خواجہ تہور حسین، ابنِ انشاء مشفق خواجہ۔ ضخامت ۲۶۴ صفحے۔ تقطیع $\frac{22 \times 18}{4}$۔ قیمت درج نہیں۔ مضامین سب معیاری ہیں۔

**شعور** - ناشر مکتبۂ شعور کراچی۔ یہ دیدہ زیب مجلّہ اپنی قسم کا واحد مجلّہ ہے۔ ٹائپ میں چھپا ہے۔ مصوّر بھی ہے۔ اردو میں ایسا مجلّہ نظر نہیں آتا۔ آخر میں چوبیس صفحات پر مشتمل کلیاتِ میرؔ کی پہلی قسط منسلک ہے۔

ہندوستان و پاکستان کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے اس شمارے میں حصّہ لیا ہے۔ مضامین اور منظومات سب معیاری ہیں۔ نئے اور پُرانے رجحانات کے امتزاج سے جو صالح ادب پیدا ہوتا ہے وہ شعور کا طرّۂ امتیاز ہے لیکن ترقّی پسندانہ رجحان اور بیداریٔ شعور پر حرف کہیں بھی نہیں آتا۔ قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ شعور مانڈوی والا لین پریڈی سٹریٹ صدر کراچی۔

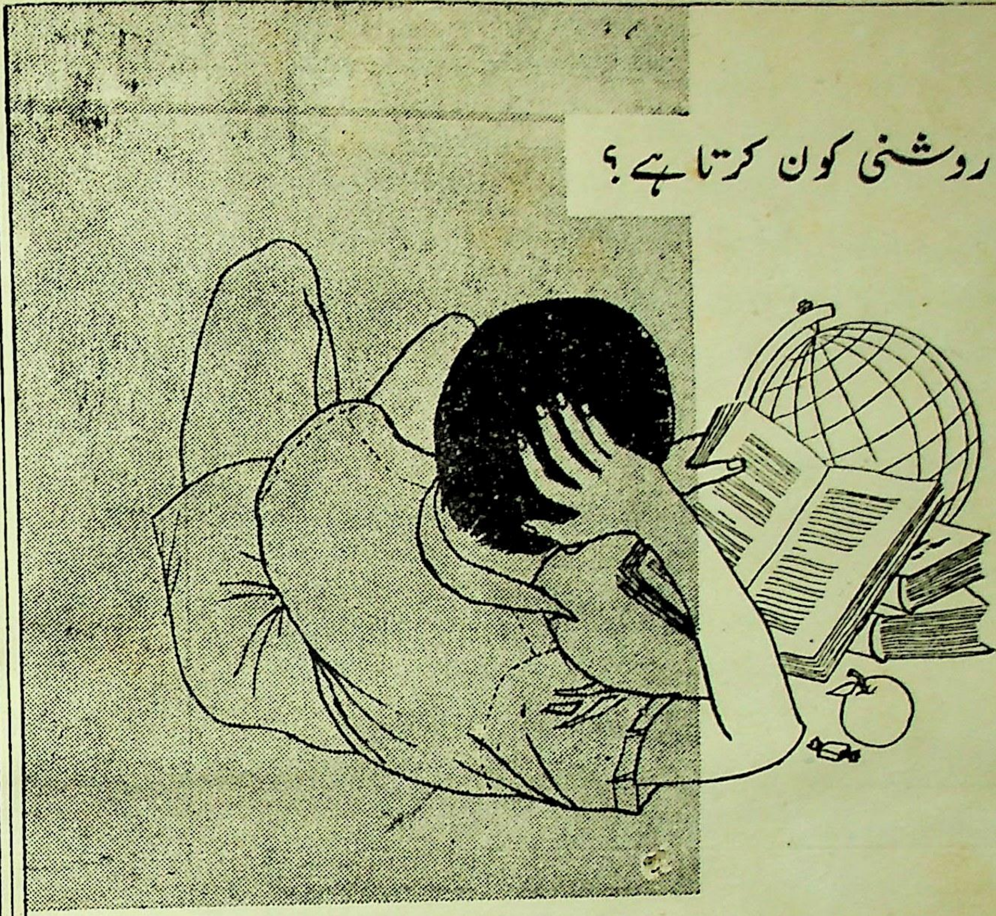
**انجمن** - انجمن ہائی اسکول بیجاپور کے طلبا طالبات نے یہ مجلّہ مرتّب کیا ہے۔ انھیں کے افکار ہیں اور انھیں کے مضامین۔ سائیکلو اسٹائل کر کے اسے طبع کیا ہے۔ یہ جدّت یہ انہماک جنوبی ہند کے دور دراز مقام پر اُردو کی خدمت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ طلبا و طالبات مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ کرے وہ اسی طرح اس ہمہ گیر اور ہمہ پسند زبان کی خدمت کرتے رہیں۔

**پمپوش** - کشمیری بزمِ ادب ۴۳۷ بلی ماران دہلی کا دو ماہی جریدہ ہندی، اردو اور کشمیری تینوں زبانوں میں مضامین کا حامل ہے۔ کشمیری زندگی اور تعمیرِ نو سے متعلق مضامین اور نظمیں اس میں شامل ہیں۔ چندہ سالانہ ۴ روپے

---

## دیہات میں بجلی

پہلے پنج سالہ منصوبے کے شروع ہونے کے وقت بھارت کے تقریباً تین ہزار دیہات کو بجلی مہیا کی جا رہی تھی اور جب یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تو کوئی سات ہزار دیہات میں بجلی پہنچائی جا چکی تھی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں اس مقصد کے لئے ایک بڑا پروگرام شامل کیا گیا ہے۔ ملک میں بجلی کے پروگرام کے لئے ۴ ارب ۷۲ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔ اس میں سے ۷۵ کروڑ روپے دیہات میں بجلی پہنچانے پر صرف کئے جائیں گے اور دس ہزار سے بھی زیادہ گاؤں کو بجلی کی سہولیات مہیا کی جائیں گی۔



# روشنی کون کرتا ہے؟

پڑھنے کے لئے روشنی چاہیئے، سیکھنے کے لئے روشنی چاہیئے اور فرصت کے اوقات میں آرام اور خوشیاں منانے کے لئے روشنی چاہیئے، ہر کسی کو روشنی کی ضرورت ہے۔ اور مٹی کے تیل کی بدولت یہ نعمت غریب سے غریب ترین گھروں تک پہونچ جاتی ہے۔ کبھی مٹی کے تیل سے بھری ایک بوتل ہی طاقت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ بن جاتی ہے کبھی دوسری قسم کے ایندھن کے ہوتے ہوئے بھی، مٹی کا تیل ہی پسند کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ سستا اور سہولت والا ہے اور ہر کہیں آسانی سے مل جاتا ہے۔ مٹی کا تیل پٹرولیم کی مصنوعات ہے اور اس کے فوائد کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ ہر موقع پر مفید ہونے والے مٹی کے تیل کے لئے فائدوں کے لحاظ سے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور معیار زندگی کی ترقی نے نئے دروازے کھول رکھے ہیں۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ مٹی کے تیل کو سارے ملک میں تقسیم کرنا خصوصاً تھوڑی تھوڑی مقدار میں اور آبادی سے کٹے ہوئے دُور دراز گاؤں میں بھیجنا کتنا مشکل اور پے چیدہ کام ہے۔ لیکن ہم برماشیل والوں نے سارے ملک میں تقسیم کرنے والے مرکزوں کا جال بچھا رکھا ہے جن کے ذریعے ملک کے کونے کونے میں تیل کی سپلائی رات اور دن مسلسل جاری رکھی جاتی ہے۔ برماشیل کے محکمہ کی وسعت اور پھیلاؤ نئی زندگی کی سہولتوں اور راحتوں کو ہندوستان کے دُور دراز دیہاتوں تک پہنچانا ہے

**برماشیل ... ہندوستان کی زندگی کا ایک حصّہ ہے**

# آج کل

## اہلِ نظر کی نظر میں

"آج کل" آج کل خوب نکل رہا ہے۔ خصوصاً موسیقی نمبر تو ایسا نکلا کہ پاک و ہند کا کوئی ادبی رسالہ اب تک ایسا نمبر پیش نہیں کر سکا، کیا باعتبارِ فن اور کیا بلحاظِ تاریخِ فن۔ یہ ترتیب کا کمال ہے۔ خدا آپ لوگوں کا حامی ہو۔ آپ حقیقت میں زبانِ اُردو کے محسن ہیں۔

(عبدالمجید سالک)

"آج کل" ان رسالوں میں ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دل چسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حُسن یعنی کاغذ چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (مسعود حسن رضوی)

"آج کل" کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیبِ مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں۔

(نیاز فتحپوری)

میں "آج کل" کو ہمیشہ بہت دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حُسن سے بھی عاری ہیں۔ (غلام السیّدین)

رسالہ "آج کل" علمی، لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔

(فراق گورکھپوری)

"آج کل" کا بجا طور پر اردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامین نثر پُر مغز اور دل چسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصّے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔

(اثر لکھنوی)

"آج کل" اردو کے اُن چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُر کیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔ (آلِ احمد سرور)

"آج کل" کے لئے میں نے لوگوں کو بے تاب اور منتظر پایا ہے۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں، اکثر ایسے علمی، تہذیبی، فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دل عزیز بناتا ہے۔ (احتشام حسین)

# ہماری کتابیں

| نام کتاب | قیمت | ڈاک خرچ |
|---|---|---|
| پہلا پنج سالہ پلان (خلاصہ ایڈیشن) | ۲٫۵۰ روپے | ۵۰ نئے پیسے |
| آسان پنج سالہ پلان | ۵۰ نئے پیسے | ۱۲ نئے پیسے |
| زمینی اصلاحات کی ترقی | ۲۵ نئے پیسے | ۱۲ نئے پیسے |
| سماجی بہبود | ۳۵ نئے پیسے | ۱۲ نئے پیسے |
| ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان | ۲۵ نئے پیسے | ۱۲ نئے پیسے |
| آپ کا گاؤں اور پنج سالہ پلان | ۵ نئے پیسے | ۶ نئے پیسے |
| ہمارے نئے سکے | ۲۵ نئے پیسے | ۱۲ نئے پیسے |
| پنج سالہ پلان ۔ سوالات و جوابات | ۲۵ نئے پیسے | ۱۲ نئے پیسے |
| دیہاتی صنعتیں | ۳۵ نئے پیسے | ۱۲ نئے پیسے |

پچیس روپیہ یا اس سے زیادہ کی
کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائیگا

قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے
ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن، منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، اولڈ سکریٹریٹ، دہلی

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D—509